مرتبہ

محمد حسین خان صاحب بی اے بی ٹی (علیگ)

اسسٹنٹ ماسٹر - اینگلو عربک کالج دہلی

ناشر

جی - آر - بھارگو - اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز چندوسی

سنہ ۱۹۳۳ء

قیمت

بھارگو اپرِنٹنگ ورکس

چندوسی

فہرست مضامین

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا
اک بندۂ نافرماں ہے حمد سرا تیرا

جچتا نہیں نظروں میں یاں خلعتِ سلطانی
کملی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا

عظمت تری مانے بن کچھ بن ہی نہیں آتی
ہیں خیرہ و سرکش بھی دم بھرتے سدا تیرا

تو ہی نظر آتا ہے ہر شے پہ محیط ان کو
جو رنج و مصیبت میں کرتے ہیں گلا تیرا

نشہ میں وہ احساں کے سرشار ہیں اور بیخود

جو شکر نہیں کرتے نعمت پہ ادا تیرا
سمجھا ہے پرے تجکو ادراک کی سرحد سے
جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا
آفاق میں پھیلے گی کبتک نہ مہک تیری
گھر گھر لئے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا
ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گذرتا ہے۔
کچھ رنگ بیاں حالی ہے سب سے جدا تیرا

---

(۲) امانت خدا

منشی تلوک چند محروم

مجنوں کا دل ہے خواہش لیلےٰ کے واسطے
وامق کا دل ہے دامن عذرا کے واسطے
بلبل کا دل بنا گل رعنا کے واسطے
پھر دل مرا ہے کس کی تمنا کے واسطے
یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے
پنہاں اسی میں راز ہیں کچھ راز داد کے

لایا تھا ساتھ عرش بریں سے اُتار کے
دامن میں پھول کچھ ہیں کہیں کی بہار کے
پہلو میں کچھ ہیں داغ کسی لالہ زار کے
یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

او قاصد شباب نہ لانا پیام عشق
چھاتی دہل گئی ہے بیاں سُن کے نام عشق
ہو جاؤں یوں تو جان سے دل سے غلام عشق
ممکن ہے بھول جاؤں کبھی پی کے جام عشق
یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

او حسن فتنہ ساز تجھے دیکھتا تو ہوں
ہے مثل سحر سامری بیشک ترا فسوں
بہتر یہی ہے عشوؤں سے ناآشنا تو ہوں
تو لاکھ عشوہ باز ہو پر دل تجھے نہ دوں
یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

صیاد نقش طائر دل سے ذرا مرے
کمبخت اپنے جال کو جا کر بچھا پرے
دانا ہے کب فریب میں آتا ہے جا پرے

مکّار جا کے مکر کے دانے گرا پڑے
یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

کتنے ہی اس کے چاہنے والے ہیں خاک میں
دم کر رکھا ہے نفس ستمگر نے ناک میں

مل جائے آہ آہ مرا دل نہ خاک میں
کیا چیز لے کے جاؤں گا درگاہ پاک میں
یہ دل مرا نہیں ہے امانت خدا کی ہے

حضرت اکبر الہ آبادی

میں نے مرشد سے کہا جا کر یہ اک دن التماس
کار دنیا نے بہت مجھکو کیا ہے اب اداس

جلوۂ دنیا نے مجھکو کر دیا ہے بے بصر
آخرت پر کچھ نہیں باقی رہی میری نظر

فلسفہ نے مجھکو دکھلایا فقط دنیا کا فیکٹ

میری چشمِ طبع کو عارض ہوئی غربی کیٹر یکٹ
میرے حق میں کوئی فکرِ سا لویشن کیجئے
ہو سکے تو مذہبی اک آپریشن کیجئے
کی توجہ حضرتِ مرشد نے میرے حال پر
اک نظر ڈالی مرے اقوال اور اعمال پر
چشمِ باطن میں دیا نشتر نگاہِ تیز کا
کٹ گیا وہ رنگ محسوسات کفر انگیز کا
پھر دیا دل پر مرے تقوے کی ٹٹی باندھ دی
آنکھ پر شوقِ لقائے حق کی پٹی باندھ دی

(۴) مزارِ دوست

مولوی سید علی کامل لکھنوی

شب کو جا نکلا تنہا کامل میں مزارِ دوست پر
مثلِ ابر اس واسطے آنکھیں مری خوں بار ہیں
قبر پر الحمد پڑھ کر دوست سے میں نے کہا
ہم گریباں چاک ماتم میں ترے اے یار ہیں

شاد ہے تو کچھ بھی زیرِ خاک اے نازکبدن
شمع روشن ہے گلوں سے قبر پہ انبار ہیں

کیا ہوا مرنے کے بعد اے راہیِ ملکِ عدم
لوگ کیسے ہیں وہاں کے اور کیا اطوار ہیں

منزلیں نزدیک ہیں یا دور ہیں کیا حال ہے
راہ میں کچھ بستیاں ہیں شہر ہیں بازار ہیں

جس محل میں جا کے تو اُترا ہے اے رنگیں ادا
کس طرح کا قصر ہے؟ کیسے در و دیوار ہیں

اہلِ صحبت کون ہیں کیا گفتگو کا طرز ہے
خوش بیاں خوش وضع ہیں کچھ فہم بدگفتار ہیں

بات کرنے کی صدا اصلا کبھی آتی نہیں
کس طرح کے لوگ ہیں سوتے ہیں یا بیدار ہیں

قبر سے آئی صدا اے دوست بس خاموش رہ
ہم اکیلے ہیں یہاں احباب نہ اغیار ہیں

پھول کیسے باغ کیا عقل تیری ہے کہاں
کنجِ تنہائی ہے اور افعی گلے کے ہار ہیں

گر نہیں وہ پیکرِ نازک ہمارا یاد ہو

آج خاکِ قبر سے اس پہ منوں کے بار ہیں
اب نہ زیادہ بات کر سکتے نہیں لے گھر کو جا
دلمیں آزردہ نہ ہو نا کیا کریں نا چار ہیں

(۵) فوّارہ

مرزا ہادی عزیزؔ لکھنوی

میرے فوّارے عجب دلچسپ ہے تیرا سماں
یہ تیری طبعِ رواں اور یہ ترا جوشِ نہاں
رات دن سانچے میں وہ موتی پہ موتی ڈھالنا
گلستانِ باغِ رضواں پر وہ ڈورے ڈالنا
گوہرافشانی تری اور ہلکی ہلکی وہ پھوار
وہ شبابِ بلبل و گل اور وہ تیرا نکھار
وہ اکڑ کے دیکھنا اپنی جوانی کی بہار
وہ ترا انگڑائیاں لینا چمن میں بار بار
مضطرب موج ہوا پر تو بہت بیتاب ہے
تیری دھاریں چھوٹتی ہیں یا کہ نخلِ آب ہے

تو چمن کی روح ہے اور ہے فضا میں تیرا دور
اک بہارِ شادمانی ہے ہوا میں تیرا دور
طائر آتے ہیں ترے دامن میں پر کھولے ہوئے
عاشقِ شوریدہ یا بیٹھے ہیں سر کھولے ہوئے
تیرے دستِ گوہر افشاں کی یہ حالت دیکھ کر
جھولیاں گلشن نے پھیلا دیں سخاوت دیکھ کر
گوندھتا موجِ ہوا پر موتیوں کے ہار کا
تیرے سر سہرا رہا ہے رونقِ گلزار کا
تیز ہو ہاں میرے فوارے ذرا پھر تیز ہو
پھر جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز ہو
آتشِ گل کا جہاں کچھ بھی اشارا ہو گیا
اڑ گیا موجِ ہوا پر یوں کہ پارا ہو گیا
تیرا جو قطرہ گیا گردوں پہ تارا ہو گیا
جب گرا آ کر زمیں پر دل ہمارا ہو گیا
سب غبارِ خاطرِ ناشاد تجھ سے دھو گیا
تیرا منظر اک طلسمِ دلفریبی ہو گیا

(۶) کنول کا پھول

پیارے لال شاکر میرٹھی

تو وہ چراغ ہے جس کو فروغ آب میں ہے
غضب کا قہر تری چشم نیم خواب میں ہے
عجب بہار ترے حسن لاجواب میں ہے
نہ یاسمن میں نزاکت نہ یہ گلاب میں ہے
ہر ایک پھول سے انداز ہے جدا تیرا
کہ دل نشیں ہے عجب کچھ پُر فضا تیرا
لبِ نسیم سحر پہ ہے گفتگو تیری
کشاں کشاں لئے پھرتی ہے جستجو تیری
ہزار دل سے ہے بھونرے کو آرزو تیری
کہ مست رکھتی ہے صہبائے خوش گلو تیری
فضائے آب میں سرمست جام ہے تیرا
شہید لذتِ شرب مدام ہے تیرا
ترے چراغ پہ پروانہ وار گرتا ہے

وفورِ شوق سے بے اختیار گرتا ہے
بلائیں لیتا ہے ہو کر نثار گرتا ہے
قریب آکے ترے بار بار گرتا ہے

یہ بیخودی یہ پر وں کی تپش یہ سرعتِ شوق
ذرا سے کیڑے میں ہے کس بلا کی وسعتِ شوق
یہ دھیمی دھیمی فغاں اور یہ ناشکیبائی
یہ جوشِ دردِ محبت یہ نالہ فرسائی
یہ آستاں پہ ترے شوق ناصیہ سائی
یہ تیرے کنج میں دن بھر نسیم پیمائی
سوادِ شب میں بھی دُھن ہے ترے شبستاں کی
مگر تلاش کسی کے ہے حسنِ پنہاں کی

(۵) شہیدِ وطن

سید نجم الہدیٰ نجم گیلانی

تڑپتا ہے تنہا وہ فرشِ زمیں پر نہ غمخوار کوئی نہ تکیہ نہ بستر
اِدھر اسکی بندوق ٹوٹی پڑی ہے گرا خاک پر ہے اُدھر اُسکا خنجر

نہ آتی ہے کانوں میں آواز ہمدم — کہ پانی پلائے اُسے ترس کھا کر
نہ توپوں کا شور اور نہ گولوں کی بارش — نہ گھوڑا نہ جھنڈا سپاہی نہ افسر
تعاقب میں دشمن کے سب چل دیے ہیں — عقب میں اُسے چھوڑا حیران و مضطر
وہ حسرت سے چاروں طرف دیکھتا ہے — کبھی لیٹے لیٹے کبھی سر اُٹھا کر
تباہی کے آثار ہر سو عیاں ہیں — بنی ہے زمیں خوں سے دریائے احمر
نہ گھر کی خبر ہے نہ غمخوار کوئی — نہ باپ اور نہ بیٹا برادر نہ مادر
سرہانے کھڑی یہ اجل کہہ رہی ہے — کہ اس زخم کاری سے ہوگا نہ جانبر

اسی کشمکش میں وہ دم توڑتا ہے
گلستانِ ہستی سے منہ موڑتا ہے

مئے قوم و ملت کے سرشار آؤ — بہادر سپاہی کا لاشہ اُٹھاؤ
وطن کی محبت میں مارا گیا ہے — اسے اس کی خاکِ وطن میں سلاؤ
بدن اسکا زخموں سے ہے چور سارا — ذرا قبر میں ہلکے ہلکے لٹاؤ
کھلا کچھ نہ غنچہ امیدوں کا اسکی — تم اب اسکی تربت پہ کلیاں چڑھاؤ
سپاہی کی عزت اگر چاہتے ہو — تو اللہ اکبر کے نعرے لگاؤ
کسی کے بچھڑنے سے گھر کا یہ نور ہوگا — سرِ شام مرقد پہ شمعیں جلاؤ
کبھی غیر قوموں میں گر جا کے بیٹھو — تو اس کی دلیری کے قصے سناؤ
مصائب کا اسکی اگر دھیان آئے — تو آنکھوں سے آنسو کے قطرے گراؤ

وہ مذہب پہ اپنے فدا ہو گیا ہے
وہ فانی سے اہلِ بقا ہو گیا ہے

(۸) پیغامِ عمل

پروفیسر وحیدالدین سلیم

مثلِ پروانہ تم اک پل میں نہ جلنا سیکھو
تا سحر شمع کی مانندِ پگلنا سیکھو
دل کو کرنا ہے اگر سوزِ محبت میں کباب
کروٹیں آگ کے بستر پہ بدلنا سیکھو
زندگی نام ہے حرکت کا تم افسردہ نہ ہو
نبض کے خون کی مانند اچھلنا سیکھو
عزم جو دل میں ہو پورا اُسے تم کر کے رہو
طفل سرکش ہوا ور ضد سے مچلنا سیکھو
چشمۂ آب ہو تم سوتے ہو کیوں زیرِ زمیں
سنگ خارا کے شگافوں سے اُبلنا سیکھو
نہ ڈرو صدمۂ طوفان سے مانند نہنگ

ورطۂ بحر کے آغوش میں پلنا سیکھو
آنچ سے رنج و مصیبت کی نہ کچھ خوف کرو
موم کی طرح ہر اک سانچے میں ڈھلنا سیکھو
ہے کٹھن منزل تسلیم تو پروا کیا ہے
سر کے بل دھار پہ تلوار کی چلنا سیکھو
کلفت دہر سے کیوں ناک چڑھاتے ہو ابھی
اس مئے تلخ کے دو گھونٹ نگلنا سیکھو
ہو کے پامال حوادث نہ ترقی سے رکو
دوب کی طرح سے دب دب کے نکلنا سیکھو

(۹) یاد طفلی

منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی

کدھر گیا آہ میرا بچپن نجات تھی جب غم جہاں سے
نہ دل تھا حسرت کش تمنا نہ تھی زباں آشنا فغاں سے
کہاں گئی وہ بہار طفلی کدھر گئے وہ نشاط کے دن
گلاب سا آہ میرا چہرہ نہ زرد تھا جب غم خزاں سے

کبھی تھا کوئل کا ہمنوا میں کبھی تھا میں ہم سرود قمری
چمن میں کرتا تھا چھیڑ چڑوں میں جا کے مرغان نغمہ خواں سے
میں دل میں خوش تھا کہ گا رہی ہے میری محبت کا یہ ترانہ
کھلا نہ تھا راز عشق گل کا جو مجھکو بلبل کی داستاں سے
بہا ئیں کاغذ کی میں نے ناویں بہت لب جو بنا بنا کے
برس گئی کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی جھڑی جو ساون کی آسماں سے
کبھی تمنا کہ چاند کو میں گھر اپنے لاؤں بنا کے مہماں
کبھی یہ حسرت کہ توڑ لاؤں میں جا کے تاروں کو آسماں سے
کبھی جو آئینے میں یکایک نظر پڑی مجھ کو اپنی صورت
رہا ہوں پہروں میں محو حیرت کہ پیاری شکل آئی یہ کہاں سے
لبوں پہ بچپن کی کیا نہ آئے گی اب وہ معصوم مسکراہٹ
ادھورے الفاظ اے جوانی! وہ کیا نہ نکلیں گے اب زباں سے

نہ تھی گراں باری مشاغل نہ تھی یہ پابندیٔ علائق
اسیر زنجیر غم نہ تھا میں نجات تھی شورش جہاں سے
مرا ہنڈولا تھا عرش اعظم مرے کھلونے تھے چاند سورج
اُتار لاتا تھا جا کے تارے زمیں پہ راتوں کو آسماں سے
مرا گھروندا تھا گھر کا آنگن۔ اسی میں مہماں تھا میرا بچپن

تجھے بلایا تھا کس نے ظالم! شباب تو آگیا کہاں سے
رہے جو تو اے شباب! مہماں بایں غم و رنج و یاس و حرماں
نہیں ہے یہ بھی مجھے توقع طلسم نیرنگ آسماں سے
ابھی ہے تیرا فشار باقی ابھی بڑھاپا ہے آنے والا
فلک کو لینا ابھی ہیں بدلے بہت سے اک جزو ناتواں سے
ہزار جھگڑے ہیں زندگی کے ہزار دنیا کے ہیں بکھیڑے
سرورؔ صدمے اٹھائیں تو کیونکر اٹھیں یہ اک مشت استخواں سے

غزل (۱۰)

مولانا حسرت موہانی

نامرادوں کو شاد کام کرو
کرم اپنا کبھی تو عام کرو

کار عاشق ہے نا تمام سو تم
قتل کر کے اسے تمام کرو

سبکی خاطر کا ہے خیال تمہیں
کچھ ہمارا بھی انتظام کرو

عاشقو ہجر سے نہ ہو بیزار
غم جاناں کا احترام کرو

رات رو رو کے جس طرح کاٹی
اسی صورت سے دن کو شام کرو

گفتگو ہیچ ہے اگرچہ ہو
کام جاں کا حصول کام کرو

موت سے پہلے ہی زراہ وفا مرمٹو عاشقی میں نام کرو
کھل سکے جب تلک نہ راہِ مراد منزلِ صبر میں قیام کرو
پوچھتے ہیں وہ جاں نثاروں کو
تم بھی حسرت اٹھو سلام کرو

(۱۱) ترک دنیا

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ

کل ایک تارک دنیا سے میں نے پوچھا ذوقؔ
کہ تو اکھڑ کے اِدھر سے اُدھر ہوا پیوست
گذر رہی ہوگی بآرام زندگی تیری
کہ تجھکو اب نہ غم نیست ہے نہ شادی ہست
کہا یہ اس نے کہ قید حیات میں انساں
کبھی نہ ہوگا دل آسودہ گو ہو مست الست
اٹھائے ہاتھ جہاں سے ولیک کیا امکاں
کہ بافراغ کروں کنج عافیت میں نشست
چھٹا جو کوئی گرفتاریوں سے دنیا کی

تو سلسلے میں فقیری کے پھر ہوا پا بست
رہا وہ خدمت مرشد کی قید میں برسوں
کہ حق پرست ہو وہ پہلے جو ہو پیر پرست
گر ایک عمر میں پہنچا مقام اعلیٰ پہ
کہا یہ شوق نے ہو ہمت بلند نہ پست
جو دستگاہ تصوف میں بھی ہوئی اس کو
تو یہ ارادہ رہا اور بھی ہوں بالا دست
ہمیشہ جنگ رہی بعد صلح کل کے بھی
کہ نفس دشمن سرکش ہے اسکو دیجے شکست
جو ہوشیار رہے تو وہ ہے شرع کا پابند
پھنسا ہوا ہے وہ کیفیتوں میں گر ہے مست
نہیں ہے دام علائق سے مطلق آزادی
مجال کیا کہ نکل جاوے کوئی کرکے جست
کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ
گیا زباں سے نکل اس کے جیسے تیر از شست
کہ کرد قطع تعلق کدام شد آزاد
بریدہ کز ہمہ با خدا گرفتار است

(۱۲) ملکۂ نورجہاں کا مزار

منشی تلوک چند محروم

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرام گہِ نورجہاں ہے
مدت ہوئی وہ شمع تہ خاک نہاں ہے
اُٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے

جلووں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے ان کی شبِ دیجور کا عالم

اے حسنِ جہاں سوز کہاں ہیں وہ شرارے
کس باغ کے گل ہو گئے کس عرش کے تارے
کیا بن گئے اب کرمکِ شب تاب وہ سارے
ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے

یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے
قابل ہی تو تھے عاشقِ دلگیر کے دل کے

تجھ سی ملکہ کے لئے یہ بارہ دری ہے

غالیچہ سبز فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالم بیچارگی اے تاجوری ہے
دن کو یہیں بسرام یہیں شب بسری ہے
ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہے مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

تعویذ لحد ہے زبر و زیر یہ اندھیر
یہ دورِ زمانہ کے الٹ پھیر یہ اندھیر
آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر یہ اندھیر
اے گردشِ ایام یہ اندھیر یہ اندھیر
ماہ فلک حسن کو یہ برج ملا ہے
اے چرخ تری ریچ نوازی کا گلا ہے

حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا
ہوتا ہے اثر دل پہ ان آثار سے کیا کیا
نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا
اُٹھتے ہیں شرارِ آہ شرربار سے کیا کیا
یہ عالمِ تنہائی یہ دریا کا کنارہ
ہے تجھ سی حسینہ کے لئے ہو کا نظارہ

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر
آرام لیا کرتے ہیں اس روضہ میں آکر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے شپّر
اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکر
معمور ہے یوں محفل جانانہ کسی کی
آباد رہے گورِ غریبانہ کسی کی
آراستہ جن کے لئے گلزار چمن تھے
جو ناز کی میں داغ دہِ برگ سمن تھے
جو گل رُخ و گل پیرہن و غنچہ دہن تھے
شاداب گل تر سے کہیں جن کے بدن تھے
پژمردہ وہ گل دبکے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خار و خس و خاشاک کے نیچے
رہنے کے لئے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے
جو پیکرِ ہستی کے لئے روحِ رواں تھے
محبوب دل خلق تھے جاں بخش جہاں تھے
تھے یوسف ثانی کہ مسیحائے زماں تھے
جو کچھ تھے کبھی تھے مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں

ٹوٹے ہوئے پنجرے سے پڑے زیر زمیں ہیں
دنیا کا یہ انجام ہے دیکھ اے دل ناداں
ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفن ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ نہ وہ قصر نہ ایواں
آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں
ٹوٹا ہوا اک ساحل راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

(۱۴) جوش جنوں

شیخ محمد ابراہیم ذوق

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے
بس کرم سوزِ دروں بھن جائیں گے دل اور جگر
رحم جوشش گریہ چھاتی پھر ابھی بھر آئے ہے
دم کی ہے سینہ میں آکر ضعف سے یہ گفتگو
دیکھئے لب تک خدا کس طرح سے پہنچائے ہے

بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے
اُف رے بے تابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے
نزع میں بھی ذوقؔ کو تیرا ہی بس ہے انتظار
جانبِ در دیکھ لے ہے جبکہ ہوش آجائے ہے

سحرِ موسیقی (۱۴)

منشی پیارے لال شاکر میرٹھی

یہ چھاؤں تاروں کی کم کم یہ نور کا تڑکا
گلوں پہ شبنم ترکے یہ گوہر شہوار
یہ جوش لالۂ صحرا یہ سبزۂ کہسار
یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا یہ نسیم عنبر بار
یہ شاخ شاخ پہ انداز زمزمہ خوانی
یہ طائران ترنم سرائے فصل بہار
فضائے عرش میں نغمہ طراز کی قدرت
ہوا کے پردوں میں بانگ سرود موسیقا
یہ دلفریبیٔ دریا کا دلربا منظر

دمِ خرام یہ موجوں کی شوخیِ رفتار
رواں ہے ہلکی سی اک سطحِ آب پر کشتی
اور اس میں ایک حسینہ بجا رہی ہے ستار
جبیں ہے چاند سی زلفِ سیاہ ہو نرا سی
کنول سے پائے نگاریں ہیں پھول سے رخسار
لباسِ حسن ہے تصویرِ پاک دامانی
ہے ساری ہلکی سی ریشم کی ایک زیب کنار
غرض کہ حسن کی ہے سر سے پاؤں تک مورت
نظر فریب ادا دلفریب نقش و نگار
سہیلی سامنے بیٹھی ہے اک سخن اندام
کہ جس کے باغِ جوانی میں ہے شروعِ بہار
عجیب وضع سے ہے چھیڑا ترانۂ شیریں
کہ جھومتے لبِ ساحل ہیں وجد میں اشجار
فسونِ نغمہ میں دلکش سکوں کچھ ایسا ہے
ٹھہر ٹھہر کے ہے چلتی صبا بدمِ رفتار
گدازِ شوق کا عالم ہے قلبِ دریا میں
ہر ایک موج میں ہے اضطرابِ نبض شرار

قریب ہو کے گزرتی ہے جوشِ مستی میں
عجیب لغزشِ مستانہ سے نسیم بہار
نہیں ہے اب لب قمری پہ نالۂ کوکو
شراب ذوقِ ترنم سے ایسی ہے سرشار
صدائے نغمہ نے افسوں کچھ ایسا پھونکا ہے
کہ ہیں سکوت میں مرغانِ شکّریں منقار
غرضکہ طرفہ ہے جادو فسونِ موسیقی
بشر تو کیا کہ بہائم کو کرتا ہے یہ شکار

(۱۵) درسِ عبرت

میر انیس

اب خواب سے چونک وقت بیداری ہے
لے زادِ سفر کوچ کی تیاری ہے
مرمر کے پہنچتے ہیں مسافر واں کے
یہ قبر کی منزل بھی غضب بھاری ہے

اک روز جہاں سے جان کو کھونا ہوگا
گھر چھوڑ کے زیرِ خاک سونا ہوگا
بالش سے سروکار نہ بستر سے غرض
اپنا کسی تکیہ میں بچھونا ہوگا

آغوشِ لحد میں جبکہ سونا ہوگا
جُز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہوئے گا انیس
ہم ہوئیں گے اور قبر کا کونا ہوگا

غافل تجھے کیوں خواہشِ دنیائے دنی ہے
پیوند زمیں ہر کوئی درویش وغنی ہے
جو قاقم وسنجاب پہنتے تھے ہمیشہ
سوتے ہیں تہِ خاک گلے میں کفنی ہے

گر لاکھ برس جئے تو پھر مرنا ہے
پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے
غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

(۱۶) آغازِ حسن و عشق

مولوی فضل الحسن حسرت موہانی

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا
باوجودِ حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا
عشق روز افزوں پہ اپنے مجھکو حیرانی نہ تھی
جلوۂ رنگیں پہ تجھ کو نازِ یکتائی نہ تھا
دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی
جبکہ تیرا حسن سرگرمِ خود آرائی نہ تھا
کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق
ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا
تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا
یاد ہیں سارے وہ عیشِ با فراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے
وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسمِ جفا

اور مجھے حاصل تھے لطفِ بے نہایت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

میری جانب سے نگاہ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغاز شرارت کے مزے

یاد ہیں وہ حسن الفت کی نرالی شوخیاں
التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے

صحبتیں لاکھوں مری بیماری غم پر نثار
جس میں اُٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے

(۱۷) جھوٹے پیر

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی

بہت سے راہ زنی کر رہے ہیں بنکر پیر
غریب قوم کو ہیں مارتے یہ شاہ مدار

ہزار دانے کی تسبیح گیروا کپڑے
یہی ہیں انکی علامات اولیائے کبار

اگر ہیں یاد تصوف کی اصطلاحیں چند
تو پہونچا عرش معلے پہ گوشۂ دستار
کسی سے نقد کہیں جنس اور کہیں دعوت
جو بس چلے تو نہ چھوڑیں مرید کا گھر بار
یہ مومنوں سے بھی جزیہ وصول کرتے ہیں
فتوح غیب رکھیں اسکا نام یا ادرار
رجوع خلق کی خاطر ہوئے ہیں گوشہ نشیں
کہ جیسے جھیل پہ بیٹھے سکڑکے بوتیمار
یہ ناز ہے کہ بزرگوں کے نام لیوا ہیں
اگرچہ ننگ بزرگاں ہوں آپکے اطوار

نئے جنٹلمین

رہا وہ جرگہ جسے چڑھ گئی ہے انگریزی
سو واں خدا کی ضرورت نہ انبیا درکار
وہ آنکھ بیچ کے بر خود غلط بنے ایسے
کہ ایشیا کی ہر اک چیز پر پڑی دھتکار
جو پوستینوں میں ہے پوشش تو لیں دریدہ کوٹ

سوار یوں میں سواری تو دم کٹا رہوار
جو ار دلی میں ہے کتا تو ہاتھ میں اک بید
بجاتے جاتے ہیں سیٹی سلگ رہا ہے سگار
وہ اپنے آپ کو سمجھے ہوئے ہیں جنٹلمین
اور اپنی قوم کے لوگوں کو جانتے ہیں گنوار
نہ کچھ ادب ہے نہ اخلاق نہ خدا ترسی
گئے ہیں ان کے خیالات سب سمندر پار
وہ اپنے زعم میں لبرل ہیں یا رڈیکل ہیں
مگر ہیں قوم کے حق میں بصورت اغیار
نہ انڈین ہی رہے وہ نہ وہ بنے انگلش
نہ ان کو چرچ میں آنے نہ مسجدوں میں بار

عام اردو شاعری

سخنوران زماں کی بھی ہے یہی حالت
کہ اس قدیم ڈگر کو نہ چھوڑیں زنہار
سوائے عشق نہیں سوجھتا انہیں مضمون
سو وہ بھی محض خیالی گھڑت کا اک طومار

نہ لکھتے ہیں کبھی نیرنگ حکمت و قدرت
نہ واقعات کے وہ کھینچتے ہیں نقش و نگار

ہے شاعری میں یہ پہلا اصول موضوعہ
کہ جھوٹ موٹ کے بنجائیں ایک عاشق زار

صفت ہے دوست کی جلّاد و ظالم و غدار
ستم شعار دل آزار بیوفا مکّار

ہے دلبروں کی بھی شامت نہ مفر رہا نہ کمر
بجائے زلف کے دو اژدہو نکی ہے پھنکار

یہ آپکے گل عارض وہی ہیں باسی پھول
پڑی ہے نزع کی حالت میں نرگس بیمار

جو ٹون ہال کی محراب ہے خم ابرو
تو ہے مژہ بھی پولس کے سپاہیوں کی قطار

زنخ کنواں ہے کہ جس میں ڈبو چکے لٹیا
بھنور ہے ناف کہ جس سے نہو گا بیڑا پار

شب فراق کا دکھڑا اگر کریں تحریر
تو ایشیا کو ڈبو دیوے دیدہ خونبار

جو ناصحوں سے ہے کھٹ پٹ تو زاہدوں سے چخ

جو ساقیوں سے لگاوٹ تو مغبچوں سے پیار
غریب شیخ پہ ہر دم دولتیاں جھاڑیں
کریں مساجد و کعبہ سے دم دبا کے فرار
کہاں ہے انکا ٹھکانا کدھر ہے انکا مقام
وہی ہے بیتِ صنم اور خانۂ خمّار
بگھارتے ہیں تصوف تو کون دے گا داد
کہاں ہیں سعدی و حافظ سنائی و عطار
کرینگے اس قدر ایمان و دین کی توضیح
کہ گویا ہیں کوئی ہفتا و ہشت کے کفار
اگرچہ ہاتھ میں تسبیح لب پہ ہو تو بہ
بنیں گے شعر میں ہاں مے پرست بادہ گسار
جمال یوسف و اعجاز عیسی و موسے
ہیں ان کی گندہ دہانی کے سامنے سب خوار
نہ کچھ خدا کا لحاظ اور نہ انبیا کا ادب
یہ ان کی نور بھری شاعری خدا کی مار

— —— ✣ ——

(۱۸) بے حسی

حضرت اکبر الہ آبادی

دلوں کو لذت معنی کا اب حس بھی نہیں باقی
جسے دیکھو قتیل صورت دنیائے فانی ہے
حدیثِ آرزوئے قرب باری ہے نظر کس کی
خدا اک لفظ ہے اور شوق موسیٰ اک کہانی ہے
ہوائے وادیٔ ایمن کہاں اب گلشنِ دل میں
نہ وہ ارنی کا خرمن ہے نہ شوق لن ترانی ہے
معاذ اللہ غفلت باریاں یہ ابر مغرب کی
کوئی آلودہ آز کوئی صرف جوانی ہے
ملا دے اپنی ہستی اشتیاق حسن باقی میں
جو اے اکبر تجھے ذوقِ حیاتِ جاودانی ہے

(۱۹) گل

ڈاکٹر سر محمد اقبال

تجھے کیا فکر ہے اے گل دلِ صد چاک بلبل کی

تو اپنے پیرہن کی چاک تو پہلے رفو کر لے
اگر منظور ہے تجکو خزاں نا آشنا رہنا
جہان رنگ و بو سے پہلے قطع آرزو کر لے
تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں
تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنیکی خو کر لے
تنگ بخشی کو استغنا سے پیغام خجالت دے
نہو منت کش ساقی نگوں جام و سبو کر لے
نہیں یہ شان خودداری چمن سے توڑ کر تجکو
کوئی دستار میں رکھے کوئی زیب گلو کر لے
صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے
انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے
چمن میں غنچہ و گل سے یہ کہہ کر اُڑ گئی شبنم
مذاقِ جور نگیں ہو تو پیدا رنگ و بو کر لے

سکوت شام (۲۰)

مولوی حامد اللہ افسر بی اے

سکوتِ شام ہے خاموش بستی ہوتی جاتی ہے

مؤذن کی صدا ہلکی ہوا کے ساتھ آتی ہے

صبا پتوں سے مل مل کر سہانے گیت گاتی ہے

کہ اب در ماندہ دن کو رات پہلو میں سلاتی ہے

سرور و انبساط و لطف کے ہمراہ شام آئی

نوید امن و راحت، لائی پیغام سکوں لائی

شفق پھولی فلک پر سرخ بادل کچھ نظر آئے

یہ جیسے لال دیوے ہیں دیواروں کے سر آئے

چمن کی سیر کرکے لوگ اپنے اپنے گھر آئے

چھتیں سونی پڑی ہیں کھیل کر بچے اتر آئے

چراغ اب رفتہ رفتہ ہو چلے روشن مکانوں میں

بسیرے کے لئے جاتی ہیں چڑیاں آشیانوں میں

بجا گھنٹہ شوالے میں پجاری نے بھجن گایا

عبادت اور موسیقی نے ہر سو کیف پھیلایا

عقیدت نے بتوں میں بھی خدا کا حسن دکھلایا

کچھ ایسا درد تھا آواز میں دل سن کے بھر آیا

خموشی بھی یکایک گونج اٹھی دیوار و در سب ہی

سڑک پر چلنے والے جھوم کر گانے لگے خود بھی

سیہ پوش ہوتا جاتا ہے جہاں آہستہ آہستہ
اندھیرا ہو چلا ہے حکمراں آہستہ آہستہ
مٹا جاتا ہے اب دن کا نشاں آہستہ آہستہ
لئے آتی ہے شب امن و اماں آہستہ آہستہ

خموشی چھا رہی ہے شور و غل کم ہوتا جاتا ہے
اجالا گھٹ چلا تاریک عالم ہوتا جاتا ہے

ملاحت ہر طرف پھیلی ملاحت ہر طرف چھائی
کہ ہلکے ہلکے کالے رنگ کی چادر میں شام آئی
پیام امن و راحت ساری دنیا کے لئے لائی
مگر اکثر مری ہر شام ہے اک شام تنہائی

سکوں و خاموشی کا دور از مہ تا بہ ماہی ہے
جہاں میں ایک میں ہوں اور ایک شب کی سیاہی ہے

(۲۱) خطاب بہ عزم

سید سراج الحسن ترمذی

اے عزم جلوہ گر ہو پھر عالم کہن میں

دے ڈال زلزلہ پھر شیرانِ صف شکن میں
او برق کے شرارے او دل جلوں کے ہمدم
اک آگ پھر لگا دے افسردہ انجمن میں
ہمت کی مے پلا کر پھر حوصلے بڑھا دے
اگلا سا کیف بھر دے پھر شیشۂ کہن میں
ہو پھر رواں رگوں میں غیرت کا خون اپنی
پیدا ہوں سورما پھر اجڑے ہوئے وطن میں
سوز و دروں عطا کر بجھتے ہوئے دلوں کو
جل اٹھیں جس سے سینے وہ بات دے جلن میں
تجھ سے ہمدردوں نے پائی ہے فتح و نصرت
اسرار ہیں جہاں کے پنہاں ترے چلن میں
تھے سورما کہاں کے بھگوان میں زور تیرا
تیری ہی گرم جوشی تھی گیو و تہمتن میں
تیشے میں کیا دھرا تھا تیری ہی اک چمک تھی
ڈالی تھی جان تو نے فرہاد کوہکن میں
کیف و سرور تیرا مجنوں کا ہم نفس تھا
ملتی تھی اس کو لذت ہر خار کی چبھن میں

نکلا تھا بل یہ تیرے وہ فخرِ ہند گھر سے
تھا رام کا سہارا تو کوہ اور بن میں

تو ہی دل و جگر میں تو ہی رواں رگوں میں
جنبش تری عمل میں جذبہ ترا سخن میں

ہے تیری فیض باری شعبوں میں زندگی کے
ہے تیری جلوہ ریزی ایوانِ علم و فن میں

ان کی زباں سے ہر دم چنگاریاں ہیں جھڑتی
دوڑائی برق تو نے جنکے لب و دہن میں

کچھ کر کے اب اٹھیں گے تجھ سے لگائی لو ہے
پنہاں شرر ہیں تیرے یاروں کے پیرہن میں

رد بہ صفت جو کل تھے پا کر ترا سہارا
پھرتے ہیں آج بپھرے وہ شیر کے بدن میں

تیرا علم اٹھا کر نکلے ہیں کچھ مہم ور
شاید حیات تازہ پیدا ہو پھر وطن میں

جو تیرا درد لے کر نا کام اٹھے جہاں سے
لاشیں تڑپ رہی ہیں ان کی پڑی کفن میں

اتنی ہو بس تمنا اے عزم ترندی کی
مرنا ہو یا کہ جینا ہو قوم کی لگن میں

(۲۲) قطعہ تاریخ وفات مولانا شاہ عبدالعزیزؒ

حکیم مومن خاں مومن

انتخاب نسخۂ دیں مولوی عبدالعزیز ۔۔۔ بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و بے مثل
جانب ملکِ عدم تشریف فرما کیوں ہوئے ۔۔۔ آ گیا تھا کیا کہیں مردوں کے ایماں میں خلل
ہے ستم اے چرخ تو کس کو یہاں سے لے گیا ۔۔۔ کیا کیا یہ ظلم تو نے بیکسوں پر اے اجل
جب اٹھائی نعش اک عالم تہ و بالا ہوا ۔۔۔ لوٹتا تھا خاک پہ ہر قدسی گردوں محل
کیا کہوں ناکس پہ تھا صدمہ کیا جیوقت دفن ۔۔۔ ڈالتا تھا خاک سر پہ ہر عزیز و مبتذل
مجلس و روآفرین تعزیت میں میں بھی تھا ۔۔۔ جب پڑھی تاریخ مومن نے یہ آ کر بے بدل

دست بے داد اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

۱۲۳۹ھ

نوٹ: ۔ آخری مصرعہ میں ہر لفظ کا پہلا اور آخری حرف کاٹ دو اور باقی
حروف کے اعداد جمع کرو بقاعدہ

جمل تاریخ
نکل آئیگی

۵۰

چاند بی بی (۳۴)

حضرت کوثر

بہت عورتیں ایسی گذری ہیں عاقل
جو مردوں سے بے شک زیادہ نہیں قابل
ہنر میں تھیں یکتا فنون میں تھی کامل
ہر اک بات کا فخر ان کو تھا حاصل
غرض ان میں سے ایک تھی چاند بی بی
دلاور تھی اور نیک تھی چاند بی بی
چڑھا فوج لے کر جو فرزند اکبر
کیا حملہ اس نے پھر احمد نگر پہ
بڑھی چاند بی بی بھی لے اپنا لشکر
دکھانے لگی ان میں مردوں کے جوہر
وہ زن تھی مگر تیغ زن بھی بڑی تھی
تھی سب فوج پیچھے وہ آگے کھڑی تھی
بڑھایا دل اس نے سپہ کا یہ کہہ کر

کہ اسے شیر مردو کیسا ہے کیا ڈر
لڑو رن میں بڑھ کر کہ تم ہو غضنفر
نہیں ہٹتے میداں سے مرد دلاور
جو بھاگو گے تو بھی نہ جاں سے بچو گے
مرو رن میں لڑ کر کہ آخر مرو گے
ضروری ہے انساں کو جاں سے گذرنا
مسلّم ہے اس دہر سے کوچ کرنا
مثل ہے کہ دنیا میں آخر ہے مرنا
جو مرنا ہے پھر کیا ہے مرنے سے ڈرنا
مرو رن میں لڑ کر کہ چرچے رہیں گے
نہیں بعد مردن بھی زندہ کہیں گے
کرو کام وہ جس سے نام وطن ہو
غلامی سے آزاد ملکِ دکن ہو
صفیں چیر ڈالو کہ تم صف شکن ہو
کریاں ہو سہرا ب ہو سیلتن ہو
لڑو گے اگر آج میدان میں بڑھ کر
دعا تم کو سب دیں گے تاریخ پڑھ کر

رہے گا کتابوں میں یہ ذکر عزت
بڑی تھی کوئی بادشاہوں سے عزت
نہ باقی رہے گی امارت نہ دولت
مگر نام عزت کو ہے کچھ اقامت
فدا جاں کرو ملک اور مال پر تم
کہ دنیا میں چمکو گے مثل قمر تم
یہ کہکر جو بی بی نے ڈھارس بندھائی
تو ان کی سمجھ میں بھی کچھ بات آئی
ہزاروں نے لاکھوں سے کی وہ لڑائی
کہ اب تک ثنا خواں ہے ساری خدائی
رہی چاند بی بی نہ فرزند اکبر
فسانہ مگر ان کا ہے ہر زباں پر

(۲۴)

میاں نظیر اکبر آبادی

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی ساتھ لے

نیکی کا بدلہ نیک ہے بد سے بدی کی بات لے
میوہ کھلا میوہ ملے پھل پھول دے پھل پات لے
آرام دے آرام لے دکھ درد دے آفات لے
کل جگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے
کانٹا کسی کو مت لگا گر مثل گل پھولا ہے تو
وہ تیرے حق میں تیر ہے کس بات پر بھولا ہے تو
مت آگ میں ڈال اور کو پھر گھاس کا پولا ہے تو
سن رکھ یہ نکتہ بے خبر کس بات پر پھولا ہے تو
کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے
جو اور کی بستی رکھے اس کا بھی بستا ہے پُرا
جو اور کے مارے چھری اسکے بھی لگتا ہے چھُرا
جو اور کی توڑے گھڑی اسکا بھی ٹوٹے ہے گھڑا
جو اور کی چیتے بدی اس کا بھی ہوتا ہے بُرا
کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہات لے

جو اور کو پھل دیوے گا وہ بھی سدا پھل پاوے گا
گیہوں سے گیہوں جو سے جو چاول سے چاول پاوے گا
جو آج دیوے گا یہاں ویسا وہاں کل پاوے
کل دیویگا کل پاویگا کلپا دے گا کلپا وے گا
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہات لے
جو چاہے لے چل اس گھڑی سب جنس یاں تیار ہے
آرام میں آرام ہے آزار میں آزار ہے
دنیا نہ جان اس کو میاں دریا کی یہ منجدھار ہے
اوروں کا بیڑا پار کر تیرا بھی بیڑا پار ہے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہات لے
تو اور کی تعریف کر تجھکو ثنا خوانی ملے
کر مشکل آساں اور کی تجھکو بھی آسانی ملے
تو اور کو مہمان کر تجھکو بھی مہمانی ملے
روٹی کھلا روٹی ملے پانی پلا پانی ملے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہات لے

اپنے نفع کے واسطے مت اور کا نقصان کر
تیرا بھی نقصان ہوویگا اس بات پر تو دھیان کر
کھانا جو کھا تو دیکھہ کر پانی پئے تو چھان کر
یاں پاؤں کو رکھہ پھونک کر یاں خوف سے گزران کر
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہات لے

غفلت کی یہ جاگہ نہیں یاں صاحب ادراک رہ
دلشاد رکھہ دلشاد رہ غمناک رکھہ غمناک رہ
ہر حال میں تو بھی نظیر اب ہر قدم کی خاک رہ
یہ وہ مکان ہے او میاں یاں پاک رہ بیباک رہ
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہات لے

تنبیہ (۴۵)

بہادر شاہ ظفر

اتنا نہ اپنے جامہ سے باہر نکل کے چل

دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل
کم ظرف پر غرور ذرا اپنا ظرف دیکھ
مانند جوش خم نہ زیادہ ابل کے چل
فرصت ہے اک صدا کی یہاں سوز دل کے ساتھ
اس پر سپند وار نہ اتنا اچھل کے چل
یہ غول وش ہیں ان کو سمجھ تو نہ رہنما
سایہ سے بچ کے اہل فریب و دغل کے چل
اوروں کے بل پہ بل نہ کر اتنا نہ چل نکل
بل ہے تو بل کے بل پہ تو کچھ اپنے بل پہ چل
انسان کو کل کا پتلا بنایا ہے اس نے آپ
اور آپ ہی وہ کہتا ہے پتلے کو کل کے چل
پھر آنکھیں بھی تو دی ہیں کہ رکھ دیکھ کر قدم
کہتا ہے کون تجھ کو نہ چل چل سنبھل کے چل
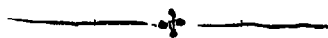
دنیا کی بہاریں (۲۶)

حضرت اختر شیرانی

(انگریزی سانیٹ کے طرز پر اردو سانیٹ (Sonnet)

یہ دنیا یہ نظارے اور یہ رنگینی فضاؤں میں
یہ جلوے چاند سورج کے یہ تابانی ستاروں کی
یہ نزہت لالہ زاروں کی یہ رفعت کوہساروں کی
یہ بھینی بھینی آوارہ سی خوشبوئیں ہواؤں میں
یہ نکھری نکھری مستی جھومنے والی گھٹاؤں میں
یہ تیزی آبشاروں کی روانی جوئباروں کی
یہ پھولوں کا ہجوم اور یہ لطافت سبزہ زاروں کی
یہ موسیقی جو رقصاں ہے پرندوں کی صداؤں میں

یہ نغمے یہ ترانے یہ شراب و شعر کا عالم
یہ آرائش مکانوں کی یہ زیبائش مکینوں کی
یہ رعنائی حسینوں کی یہ صحبت نازنینوں کی

یہ عمریں یہ بہاریں یہ شباب و شعر کا عالم
نہ لے جا خلد میں یارب یہیں رہنے دے تو مجکو
یہ دنیا ہے تو جنت کی نہیں ہے آرزو مجکو

خزاں (۲۷)

(ماخوذ از شیلی)

سید خیرات علی زیدی

خزاں کی سلطنت قائم تھی چاروں سمت جنگل میں
ہوا میں برف کی تاثیر تھی اور سخت سردی تھی
شجر جتنے تھے صحرا میں کھڑے تھے سر بہ سر عریاں
زمیں پر نام کو اک پھول باقی تھا نہ پتی تھی
جھکائے سر کو سینے پر وہیں چپ چاپ اک چڑیا
کہ جس کو دیکھنے سے دل کو مایوسی سی ہوتی تھی
قریب اک نہر کے اک جھاڑ کی بے برگ ٹہنی پر
تن تنہا غم محبوب میں ناشاد روتی تھی
فضا میں یوں تو چاروں سمت سناٹا سا چھایا تھا
مگر کچھ فاصلے پر چل رہی تھی ایک پن چکی

(۴۸) اجنبی

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

صنم فرنگ قمر جبیں بتِ سیم رنگ غضب حسیں
وہ عذار نازک و شرمگیں کہ رقیب ساغرِ آتشیں
وہ ہوا میں کاکلِ عصفریں کہ شہاب ثاقب شب رواں
ورقات غنچہ گلاب گوں دو لبِ گداز پر از فسوں
مژہ دراز کج و نگوں میں نہاں دو دیدۂ نیلگوں
کہ سحر کے پردۂ ارغواں میں فضائے گنبد آسماں
تجھے میں نے دیکھا ہے اک نگہ نہیں مجھ سے تو ذرا آشنا
ترے عشق میں ہوں میں مبتلا بسلاسل الم و بلا
مجھے کیا پتہ کہ ہے اب کہاں تجھے کیا خبر گئی کس کی جاں

(۴۹) زندگی

ابو الاثر حفیظ جالندھری

جز ملیب بستن نہیں تاب بیان زندگی

ہے فنا تمہید شرح داستان زندگی
جستجو سے یہ ملا آخر نشان زندگی
چند قبریں نقش پائے رہروانِ زندگی
اے مصور ایک تصویر اس طرح کی کھینچ دے
بار دوش بیکسی کوہ گرانِ زندگی
ہیں خیالی صورتیں ہنگامہ آرائے وجود
محشرستانِ توہم ہے جہان زندگی
ہے مثال دود اپنا عالم بود و نمود
یعنی شاخ شعلہ پر ہے آشیان زندگی
صرف گلشن ہے بجائے آبِ خون آرزو
ہے بہار زندگی گو یا خزانِ زندگی
آرزو پھر آرزو کے بعد خون آرزو
ایک مصرع میں ہے ساری داستان زندگی

غزل

(۳۰)

ڈاکٹر سر محمد اقبال

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم ہائے سیاہ کو ترے عفو بندہ نواز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں
تجھے کیا بتایئے ہم نشیں ہمیں موت میں جو مزا ملا
نہ ملا مسیحا و خضر کو وہ نشاط عمر دراز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں
دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایت سوز میں نہ مری حدیث گداز میں
جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

(۳۱) جوہر کامل

حکیم احمد شجاع بی اے

یہی معیار ہے دنیا میں بس اک مرد کامل کا

نہیں مرعوب ہوتیں اس کی آنکھیں فرد شوکت سے
پیام حق سنا دیتا ہے وہ کسرٰے کی محفل میں
نہیں ڈرتا کسی نظارۂ باطل کی ہیبت سے
وہ نان خشک پر ہی اپنی راتیں کاٹ لیتا ہے
اگر حاصل ہو ہاتھوں کی مشقت دن کی محنت سے
وہ سیدھا تیرتا ہے شیر کی مانند دریا میں
نہیں جھکتا کسی فرعون بے ساماں کی طاقت سے
نہیں شرمندۂ دستِ کرم دستِ سوال اسکا
نہیں ہٹتا وہ عزت سے نہیں گھٹتا وہ ذلت سے
وہ ٹکراتا ہے پتھر سے وہ لڑتا ہے مقدر سے
جگہ اپنی بنا لیتا ہے دنیا میں وہ ہمت سے
اگر ذلت سے نعمت ہو میسّر تھوک دیتا ہے
وہ اپنا پیٹ بھر لیتا ہے فاقے کی مصیبت سے
سمجھ لیتا ہے، ہے سنجاب و قاقم بوریا اسکا
اگر بچھ جائے ہاتھوں سے اگر مل جائے عزت سے
ادا کرتا ہے اپنے فرض کو وہ فرض کی خاطر
نہیں رسوا ہے اس کی حق شناسی طمع دولت؛

انہیں اوصاف کامال کسی دن تہا مسلماں بہی
ملے تہے جوہر کامل اسے صناع فطرت سے

(۳۲) زمزمہ نشاط

اعجاز حسین صاحب بی اے

زندگی مزے کی ہے لطف جان اٹھائے جا
لطف جاں اٹھائے جا یہ مزے اڑائے جا
حملہ ہائے فکر و غم ہوں اگرچہ دمبدم
وار سب بچائے جا فکر و غم ٹلائے جا
ظلم دشمناں سہی جور دوستاں سہی
رشکِ راز داں سہی بھول جا بھلائے جا
داغ رفتگاں سہی سوزش نہاں سہی
داغ یہ چھپائے جا آگ یہ بجھائے جا
ماجرائے حسن و عشق خارِ دل اگر بنے
دل سے تو نکال پھینک یہ خلش مٹائے جا
زندگی کہیں جسے وہ تو سیل آب ہے

بہ چل اور بہائے جا بہ چل اور بہائے جا
شب زیادہ شمع کم ہے اگر تو کیا ہے غم
جب تلک کہ جل سکے بید ھڑک جلائے جا
مغتنم ہے ساقیا فرصت انبساط کی
پی بھی اور پلائے جا پی بھی اور پلائے جا
ماضی پہ خاک ڈال کل پہ چھوڑ کل کا حال
جام و شیشہ اب سنبھال دور مے چلائے جا
جو ہوا وہ ہو چکا عاقبت کی فکر کیا
آج ہے بڑا مزا یہ مزا اڑائے جا
خدمت خدا و خلق ہے نشاط زندگی
اس میں اپنا جان و مال شوق سے لگائے جا

(۴۴)

پروفیسر محمد دین تاثیر ایم اے

اب جاگ کہ شب کے ساغر میں سورج نے وہ پتھر مارا ہے
جو مے تھی وہ سب بہ نکلی ہے جو جام تھا پارا پارا ہے

مشرق کا شکاری اٹھا ہے کرنوں کی کمندیں پھینکی ہیں
اک پیچ میں قصر اسکندر اک پیچ میں قصر دارا ہے

ہاں دیکھ کہ میخواروں کے من میں کیسی موج سمائی ہے
شیشوں کو کیا ہے چورا چورا مے کو آگ لگائی ہے
شعلے لرزاں۔ لرزاں رقصاں۔ رقصاں ہے ہر ذرہ ذرہ
فرش زمیں سے عرش بریں تک ایسی جوت جگائی ہے

بے اعتدالی (۳۴)

خواجہ الطاف حسین حالی

تم اے خود پرستو طبیعت کے بندو!
ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے
نہیں کام کا تم کو اندازہ ہرگز
جدھر ڈھل گئے ہو رہے بس اُدھر کے
جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت
تو چیخ اُٹھے دو دن میں ہمسائے گھر کے

جو مجرے میں بیٹھو۔ تو اٹھو نہ جب تک
کہ اُٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کرکے

اگر پل پڑے چوسر اور گنجفہ پر
تو فرصت ملے شاید اب تم کو مر کے

پڑا مرغ بازی کا لپکا تو جانو
کہ بس مٹن گئے عزم جنگ تتر کے

چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر
تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے

جو ہے تم کو کھانے کا چسکا تو سمجھو
کہ چھوڑیں گے اب آپ دوزخ کو بھر کے

جو پینے پہ آؤ تو پی جاؤ اتنی
رہیں یاؤں کے ہوش جس میں نہ سر کے

جو کھانا تو بے حد جو پینا تو ات گت
غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے

تین جام (۳۵)

کیفؔ مرادآبادی

لذتِ سجدہ تری سجدہ نوازی کی دلیل
کثرتِ شوق تری جلوہ طرازی کی دلیل
ذوق کا تیرے پتہ دیتی ہے میری ہستی
یعنی آئینہ ہے اک آئینہ سازی کی دلیل

عشرتِ دیدہ مرے شوقِ تماشا کا مآل
لذتِ عشق مرے ذوقِ تمنا کا مآل
میری ہستی کا پتہ دیتی ہے اس کی ہستی
کیفؔ دیکھا یہ مرے شوق کی دنیا کا مآل

کثرتِ غم ہے مرے شوقِ نمایاں کی تڑپ
شدتِ درد ہے میرے غمِ پنہاں کی تڑپ
بجلیاں خیرہ کئے دیتی ہیں آنکھوں کو مری
دیکھنا کیفؔ ذرا جلوۂ جاناں کی تڑپ

(۳۶) حقیقتِ دل

میر تقی میر

جا کے پوچھا میں یہ اک کارگہِ مینا میں
دل کی صورت کا بھی اے شیشہ گراں ہے شیشہ
کہنے لاگے کہ کدھر پھرتا ہے بہکا اے مست
ہر طرح کا جو تو دیکھے ہے کہ یاں ہے شیشہ
دل ہی سارے تھے یہ اک وقت میں جو کر کے گداز
شکل شیشے کی بنائی ہے کہاں ہے شیشہ

(۳۷) مایوسی

مرزا غالب

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے

کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

غزل (۳۹)

ضیاء احمد صاحب ایم اے

کثرت میں بھی وحدت کا جلوہ نظر آتا ہے
ہر قطرہ میں مجھے قطروں کے دریا نظر آتا ہے
ہے تربت عاشق کا بگڑا ساا نشاں باقی
اک نقش وفا وہ بھی دھندلا نظر آتا ہے
انوار حقیقت ہوں کیا عکس فگن دل میں
مدت سے یہ آئینہ دھندلا نظر آتا ہے
خود رفتگیٔ دل نے کب قید جہت رکھی
ہر سمت نگاہوں کو کعبہ نظر آتا ہے
ناداں نہ کر تکیہ ترکیب عناصر پر
مجھکو تو یہ شیرازہ بکھرا نظر آتا ہے

گلشن میں بہار اب کی میخانہ بدوش آئی
ہر پھول مجھے جام صہبا نظر آتا ہے۔
گردید کی خواہش ہے کر ذوق نظر پیدا
پھر دیکھ حجابوں سے کیا کیا نظر آتا ہے
اللہ رے رنگینی نقاشِ تصور کی
مجنوں کو ہر اک ذرہ لیلا نظر آتا ہے
تھی گرمیٔ ہنگامہ دم سے دلِ وحشی کے
اب تو مجھے صحرا بھی سونا نظر آتا ہے
آتا ہے ضیا رونا بے رنگیٔ الفت پر
اک شیشۂ دل وہ بھی ٹوٹا نظر آتا ہے

(۳۹) تاج محل

مہاراج بہادر برق دہلوی

بساط خاک پہ تو ہے نگار خانۂ حسن
سر لوح زمیں فسانۂ حسن
جبین سنگ پہ منقوش ہے ترانۂ حسن

نظر نواز ہے یا گوہرِ یگانۂ حسن

خجل ہے جلوۂ مہتاب ہے وہ ضو تجھ میں

عیاں ہے شان ادائے عروسِ نو تجھ میں

ز فرق تا بقدم پیکرِ حسیں ہے تو

ردائے نور میں ملبوس نازنیں ہے تو

مرقعِ کششِ حسنِ دلنشیں ہے تو

بہارِ خلد کی تصویرِ بالیقیں ہے تو

فروغِ دیدہ و دل جنتِ نظارہ ہے

ضیا فشاں کرۂ ارض پر ستارہ ہے

شگفتہ تختۂ نسریں ہے کہ قصرِ بلور

سپیدۂ سحری ہے کہ خرمنِ کافور

نظارہ کفِ سیلاب ہے کہ چشمۂ نور

مزار خاک پہ یا ضو فگن ہے شعلۂ طور

نثارِ جلوۂ سیمیں ہے چشمِ نظارہ

فدائے شوکتِ تزئین ہے چشمِ نظارہ

عجائبات زمانہ میں انتخاب ہے تو

زمیں پہ منزلِ فردوس کا جواب ہے تو

سپہرِ حسن ہے یا برجِ ماہتاب ہے تو
نگار خانہ صنعت کنارِ آب ہے تو

یہ تیرا عکس ہے سیلاب کی روانی میں
کہ اک سفینۂ زریں پڑا ہے پانی میں

نہاں ہے گوہرِ نایاب تیرے دامن میں
خموش شمع فروزاں ہے کنجِ مدفن میں

بہارِ حسن ہے خوابیدہ صحن گلشن میں
سکوں پذیر ہے ممتاز اپنے مسکن میں

حریم خاک میں ہیں حسن و عشق ہم آغوش
ہیں محوِ خوابِ عدم تاج و تاجدار خموش

(۴) میر و غالب و اقبال

پروفیسر حامد حسن قادری

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے
جن کے فیضِ طبع نے اردو کو گنجِ زر دیا

اک اثر میں بڑھ گیا اک رفعتِ تخئیل میں
تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا
کائناتِ شاعری ہیں بس یہی دونوں کمال
تیسرے میں اس لئے دونوں کو یکجا کر دیا

دل

(۱۴)

بشبیر احمد خاں

کسی کی محبت میں مجبور ہے دل
کسی کی مروت سے معمور ہے دل
کسی کی صداقت میں مدہوش ہر حال
کسی کی شجاعت سے مخمور ہے دل
اُسے کیا خبر کیا یہاں ہو رہا ہے
خدا جانے کس جا کہیں دور ہے دل
مشقت کا دوزخ مسرت کی جنت
کبھی نار ہے اور کبھی نور ہے دل
شکایت کی جسکو اجازت نہیں ہے
وہ مزدور مقہور و مجبور ہے دل
بلا سے کرے مسترد اس کو دنیا
کسی کی نظر میں تو منظور ہے دل
حقیقت ہے کیا اسکی دنیا نہ سمجھی
بہت گرچہ دنیا میں مشہور ہے دل
فقط اہل دل دیکھ سکتے ہیں اسکو
جہاں کی نگاہوں سے مستور ہے دل
بشیر و فا کیش غم میں بھی خوش ہے
کہ ہے روح شاداں جو رنجور ہے دل

زندگی

(۴۲)

ظہیر الاسلام فاروقی

ہے وبال دوش جس دن سے وبالِ زندگی
کر رہا ہے زندگی دو بھر سوالِ زندگی

مٹ گئیں وہ حسرتیں وہ ولولے جاتے رہے
موت سے بھی ہو گیا بدتر خیالِ زندگی

فاقہ مستی مطمئن ہے زر پرستی مضطرب
یہ عروجِ زندگی ہے وہ زوالِ زندگی

ایک جانب کچھ کھنڈر ہیں اک طرف مٹی کا ڈھیر
دیکھ غافل چشمِ عبرت سے مآلِ زندگی

زندگی اک قید ہے مر کر بھی آزادی نہیں
سنتے ہیں محشر میں بھی پوچھیں گے حالِ زندگی

سو رہو اک گوشۂ تربت میں جا کر سو رہو
فتح کر کے آئے ہو جنگ و جدالِ زندگی

عشق نے سکھلا دئیے ہیں انکساری کے مزے

اب کہاں باقی رہا جاہ و جلالِ زندگی
ہمتِ آدم کے آگے لا سکا کوئی نہ تاب
دیکھنے بیٹھے ازل میں جب کہ فالِ زندگی
زندگی ہے یا کہ یادداشتِ عمل ہے اسے ظہیر
کوئی بتلا دے یہ کیا ہیں چند سالِ زندگی

(۳۴)

فلسفہ غم

حضرت آمین حزین

کام اشکوں سے لے چشمِ نم کا ‏ ‏ جانتا ہے وہ فلسفہ غم کا
سچ تو کہتے ہیں پھول ہنس ہنس کر ‏ ‏ کچھ بھروسا نہیں آمین دم کا

ذکر مت چھیڑ چشمِ پُرنم کا ‏ ‏ تجھکو سودا ہوا ہے ماتم کا
یوں ہی بدنام کر نہ فطرت کو ‏ ‏ خود ہی موجب آمیں ہے تو غم کا

قول کیا خوب ہے آمیں جم کا ‏ ‏ غم نہ کھانا علاج ہے غم کا
بیٹھ جائے جو غم کے صدمے سے ‏ ‏ دل نہیں ہے وہ ابن آدم کا

وار کاری بھی ہو اگر غم کا — تو نہ ہونا رہین مرہم کا
غم کی گھڑیوں کو ٹالنا ہنس کر — ہے آئین فرض ابن آدم کا

(۴۴) کیا ملا

مولوی عبدالحی بیخود بدایونی

ازل میں داد و دہش کا جو حکم عام ہوا
تو سب کو مال ضرور ہی علی الحساب ملا
کسی کو عالم طفلی کا عیش اور آرام
کسی کو راحت و عشرت بھرا شباب ملا
کسی نے دولت ارمان و آرزو پائی
کسی کو خلعت اندوہ و اضطراب ملا
کسی کے بانٹ میں قسمت سے شوخیاں آئیں
کسی کو شرم عنایت ہوئی حجاب ملا
کسی کی جان کو تکلیف انتظار ملی
کسی کے دل کو غم ہجر کا عذاب ملا
کسی کو پردہ نشینوں کا غم نصیب ہوا

کسی کو عشقِ رُخِ یار بے نقاب ملا
جو عاصیوں کے اجارے میں معصیت آئی
تو زاہدوں کو طریقِ رہِ صواب ملا
کسی کی بات نے اعجازِ عیسوی پایا
کسی کے قلب کو آزارِ التہاب ملا
کسی کو ذوقِ کبابِ جگر حصول ہوا
کسی کو شوقِ قدح نوشیٔ شراب ملا
کسی نے عشوہ گردِ کج نظر لقب پایا
کسی کو بے خود شوریدہ سر خطاب ملا
کسی کے بخت نے پائی سپہر کی گردش
کسی کے دل کو زمانے کا انقلاب ملا
کسی کو عقل کسی کو تمیز ہاتھ آئی
کسی کو ذہن ہزاروں میں انتخاب ملا
ملا زمیں کو شرف جلوۂ حسیناں سے
فلک کو بہرِ ضیا نورِ آفتاب ملا
غرض کہ میں نے کیا جس قدر خیال اس دن
ہر اک اپنی مرادوں پہ کامیاب ملا

مگر نصیب سے بیخود ہی رہ گیا محروم
نہ کچھ عذاب ہی پایا نہ کچھ ثواب ملا
پھر اب کہو کہ دیا کیا۔ کسی نے کچھ نہ دیا
پھر اب کہو کہ ملا کیا۔ فقط جواب ملا

(۵۴) سرائے فانی

نواب مرزا شوق

جائے عبرت سرائے فانی ہے — موردِ مرگ ناگہانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے — آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اس جا ہے آشیانۂ بوم
بات کل کی ہے نوجواں تھے جو — صاحب نوبت و نشاں تھے جو
آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی — نام کو بھی نہیں نشاں باقی
غیرت حور مہ جبیں نہ رہے — ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
جو کہ تھے بادشاہِ ہفت اقلیم — ہوئے جا جا کے زیر خاک مقیم
کوئی لیتا بھی اب نہیں یہ نام — کونسی گور میں گیا بہرام

اب نہ رستم نہ سام باقی ہے — اک فقط نام ہی نام باقی ہے
کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج — آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج
تھے جو خودسر جہان میں مشہور — خاک میں مل گیا سب انکا غرور
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے — نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے — استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے
تھے جو مشہور قیصر و فغفور — باقی انکا نہیں نشانِ قبور
تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر — ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسیں — کھا گئے ان کو آسمان و زمیں
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے — یہی دنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتہ — نہ کسی جا ہے نلدمن کا پتہ
بوئے الفت تمام پھیلی ہے — باقی اب قیس ہے نہ لیلی ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحان — پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

امید

(۴۶)

سید محمد مرتضیٰ بیان

زمانہ اگر صحن باغ ارم ہے — تو اے امید اسکی ابر کرم ہے
شگوفوں میں چھپتی ہے تو مسکرا کر — تو ہی کھلکھلاتی ہے پھولوں میں آکر
تمنا کے کھیتوں میں ہلچل ہے تیری — تمدن کے میداں میں چلبل ہے تیری
توہی یاں کے پودوں کو دیتی ہے پانی — ہرا تجھ سے ہے گلشن زندگانی
شگوفوں کے کوچوں میں تو دوڑتی ہے — یہ تو دوڑتی ہے کہ بو دوڑتی ہے
ترے سر پہ تاج شہی سج رہا ہے — ترے در پہ کوس شہی بج رہا ہے
چڑہی تو مخالف پہ لشکر کو لیکر — پھری باج لیکر چلی تاج لیکر
دیا تو نے سلطاں کو خلعت سنہرا — ہوا میں تری اڑ رہا ہے پھریرا
رہی کوہ کنی عشق کے دنگلوں میں — پھری قیس کے ساتھ تو جنگلوں میں
تہ چاہ یوسف کو تو نے سنبھالا — کیا تو نے یعقوب کے گھر اجالا
خلیل خدا کو جب آتش میں بھیجا — کیا تو نے چھینٹوں سے ٹھنڈا کلیجہ
توہی ہے جوانوں کے گھوڑوں کی کاٹھی — توہی ہے ضعیفوں کے ہاتھوں کی لاٹھی
اٹھایا اپاہج کو بستر سے تو نے — جلایا ہے مردوں کو ٹھوکر سے تو نے

جگاتی ہے جھینٹوں سے تو غافلوں کو ... اُٹھاتی ہے شوخی سے تو کاہلوں کو
رگوں میں لہو بنکے تو دوڑتی ہے ... ترے ساتھ ساتھ آرزو دوڑتی ہے
تو ہی ڈوبتی ناؤ کا ہے کنارا ... تو ہی دیتی ہے ڈوبتوں کو سہارا
دلہن کربلا میں بنی تو مچل کر ... بن آئی شہادت کا بانا بدل کر
سمندر میں نیلسن کو لیکر بڑھی تو ... ولنگٹن کو میدان میں لیکر چڑھی تو
کولمبس کو تیری ہی لہر آرہی تھی ... ڈگاما کی آنکھوں میں لہرا رہی تھی
گئی جیت تو بازی نیچرل بھی ... سُنا دے پھڑکتی ہوئی اک غزل بھی

کلیسا میں بت کی ادا بن گئی تو ... حرم میں پہونچکر خدا بن گئی تو
یہ پردے کی ہے بات سن لے نہ کوئی ... کہ پردے میں کیا جانے کیا بن گئی تو
اکٹھا کیا تونے بچھڑے ہوؤں کو ... کہ جنگل میں بانگِ درا بن گئی تو
لگائی ہے لو تجھ سے اُجڑے ہوؤں نے ... اندھیرے گھروں میں دیا بن گئی تو
تری لاگ سے زور گھٹنوں میں آیا ... کہ دکھیا تنوں کی عصا بن گئی تو
سکندر نے تاکا اندھیرے میں تجکو ... تجلّا سے آبِ بقا بن گئی تو
گریباں میں چلکر جنوں بن گئی تو ... دوپٹے میں چھپ کر حیا بن گئی تو
ہر اک راہ میں راہبر ہو گئی تو ... ہر اک ناؤ میں ناخدا بن گئی
ہر اک رنج و غم کو کیا محو تونے ... ہر اک درد دکھ کی دوا بن گئی

یہاں تو وہاں تو سقر تو جناں تو　　جزا بن گئی تو سزا بن گئی تو
دلوں میں اتر کر تمنا ہوئی تو　　زبانوں پہ چڑھ کر دعا بن گئی تو
بیاں کے سوا تو نے سب سے نباہی
یہیں آ کے بے دست و پا بن گئی تو

(۷۴) سر سید احمد خاں

شبلی نعمانی

وہ کشتۂ قوم وہ فدائی　　اٹھائے کاسۂ گدائی
صورت سے عیاں جلال شاہی　　چہرے پہ فروغ صبحگاہی
وہ ریش دراز کی سپیدی　　چٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
وہ ملک پہ جان دینے والا　　وہ قوم کی ناؤ کھینے والا
اک ایک سے عرض حال کرتا　　در در وہ پھرا سوال کرتا
ہر بزم و ہر انجمن میں پہونچا　　ہر باغ میں ہر چمن میں پہونچا
کاوش سے غرض تھی نہ کد سے　　ملتا تھا ہر ایک نیک و بد سے
مردان خدا پرست سے بھی　　رندان سیاہ مست سے بھی
ہر زاہد و بادہ خوار سے بھی　　ملتا تھا وہ گل سے خار سے بھی
تھیٹر تھا جو گرم سیر ہو کر　　کعبے بھی گیا وہ دیر ہو کر

مطلب تھا جو خوب و زشت سے بھی | گذرا حرم و کنشت سے بھی

پستی سے ملا فلاک کی صورت | ذروں میں رہا چمک کی صورت

صوفی، عالم، رشید و گمراہ | ڈالا گھرانِ صاحب جاہ

دانش طلبانِ نکتہ اندوز | کم حوصلہ گانِ حیلہ آموز

مطلب کا ہر اک سے تھا طلبگار | ہر خوان سے تھا وہ ذلہ بردار

گذرا وہ ہر ایک رہگذر پر | دی اُس نے صدا ہر ایک در پر

کس بزم میں یہ فغاں نہ پہنچی | آہ! اُسکی کہاں کہاں نہ پہنچی

ہر ایک کو یہ ماجرا سنایا | ہر بزم میں اپنا راگ گایا

نالے کئے داغِ دل دکھا کر | رویا کبھی حال غم سنا کر

کیا کیا نہ مصیبتیں اٹھائیں | ہر طرح کی ذلتیں اُٹھائیں

ناکام رہا صدائیں دیکر | دشنام سنیں دعائیں دیکر

حنظل پائے شکر کے بدلے | سنگ اس کو ملے گہر کے بدلے

لعل اُس نے دئیے شرار پائے | گل نذر کئے تو خار پائے

کیا تلخ ملے جواب اُس کو | کیا کیا نہ دئیے خطاب اسکو

برگشتہ کہا کسی نے دیں سے | لعنت کا صلہ ملا کہیں سے

خود قوم کو ہو گئی تھی یہ کد | زندیق کہا کسی نے مرتد

چرچے تھے یہی نہ غرب تا شرق | وہ اپنی ہی دھن میں تھا مگر غرق

گو ناوکِ ظلم کا ہدف تھا
وہ شیفتہ پھر بھی سر بکف تھا

منظور جو قوم کا تھا اعزاز
ذلت پہ بھی اپنی تھا اسے ناز

دشنام کو وہ دعا ہی سمجھا
وہ درد کو دوا ہی سمجھا

جور اس نے سہے کرم کے بدلے
لطف اس نے کئے ستم کے بدلے

ہر چند یہ مشکلیں تھیں درپیش
گو غیر تھے سب یگانہ و خویش

دل کو نہ رہا تھا آسرا بھی
یاروں میں وفا نہ تھی ذرا بھی

بیگانہ عزیز خویش ٹھہرا
سمجھا جسے نوش نیش ٹھہرا

یہ زحمتیں گو تھیں ساتھ اس کے
پُر زور رہے پر جو ہاتھ اس کے

آگے وہ بڑھا ہٹا کے سب کو
طے کر کے رہا رہِ طلب کو

آئے تھے جو سنگِ راہ بنکر
سب اُڑ گئے برگِ کاہ بنکر

ناکام رہے وہ جن کو تھی لاگ
خاشاک سے دب سکی نہ یہ آگ

کی خس نے اگرچہ لاکھ تدبیر
صرصر کا نہ ہو سکا عناں گیر

آتش پہ ٹھہر سکا نہ سیماب
خاشاک سے رُک سکا نہ سیلاب

باطل کو جو حق نے کر دیا پست
اب نیت نے پائی صورتِ ہست

آہوں نے دکھائی اس کی تاثیر
کام آئے وہ نالہائے شبگیر

پُر درد جو اس کی داستاں تھی
لبریز اثر جو وہ فغاں تھی

ٹھنڈے ہوئے تھے جو گرم خو تھی
دل تھام کے رہ گئے عدو بھی

ہمّت تھی جو شمع راہ اسکی | خالی نہ گئی وہ آہ اس کی
ہوتی تھی کہ قوم کے پھریں دن | نالے نہ رہے اثر کئے بن
جادو کی بھری ہوئی وہ تقریر | ہونٹوں سے ٹپک رہی تھی تاثیر
ترغیب کے ساتھ ساتھ تہدید | کچھ یاس تو کچھ نویدِ امید
کچھ لطف بھی تھا عتاب کے ساتھ | تھا زہر پہ قندِ ناب کے ساتھ
باتوں میں اثر تھا کس بلا کا | اک بار جو رُخ پھرا ہوا کا
امید کی بڑھ گئی تگ و تاز | اونچی ہوئی حوصلوں کی پرواز
خواہش کے بدل گئے ارادے | ہمت نے قدم بڑھائے آگے
وہ دوڑ چلے جو پا بہ گل تھے | آندھی ہوئے جو فسردہ دل تھے
جو تھا وہ عجیب جوش میں تھا | مخمور بھی اب تو ہوش میں تھا
اب ملک کے ڈھنگ تھے نرالے | اخبار، کہیں۔ کہیں رسالے
تعلیم کے جابجا وہ جلسے، | گھر گھر میں ترقیوں کے چرچے

بیتاب ہر ایک جزو کل تھا
ہر بار "بڑھے چلو" کا غل تھا

(۴۸) موت کا وقت

منشی پیارے لال شاکر میرٹھی

موسم خاص میں ہوتے ہیں غنچہ برگ فشاں
پھول مرجھاتے ہیں جب باغ میں آتی ہے خزاں
صبح ہوتی ہے تو ہوتے ہیں ستارے پنہاں
لیکن اے موت مقرر ہے ترا وقت کہاں

دن کو ہوتا ہے غم دہر سے ہر ایک کو کام
دوست ملجائیں بہم آتی ہے اسواسطے شام
رات ہوتی ہے کہ ہو سبکو میسّر آرام
لیکن اے موت ترے آنے کے ہیں وقت تمام

ہم کو معلوم ہے کب بدر کا ہوتا ہے ہلال
اڑ کے کب جائینگے مرغان ہوا سوئے شمال
کب خزاں آکے گلستاں کو کرے گی پامال
کون بتلائے کہ کب کیجے ترا استقبال

کیا وہ موسم ہے ترا جبکہ بہار آتی ہے۔

اور صبا حسن گل تر کو نکھار آتی ہے
یا خزاں باغ میں جب لے کے غبار آتی ہے
نہیں ہر وقت تو کرنے کو شکار آتی ہے
تو وہاں بھی ہے جہاں ملتے ہیں دو سینہ فگار
دکھڑے رونے کے لئے بیٹھ کے زیر اشجار
تو وہاں بھی ہے جہاں ملتی ہیں فوجیں خونخوار
اور دکھاتی ہے جہاں رزم میں جوہر تلوار
بحر و بر سبکو ہے منظور اطاعت تیری
کر رہی کام ہوا میں بھی ہے طاقت تیری
دل سے راحت میں بھی جاتی نہیں ہیبت تیری
ہم جہاں جائیں نظر آتی ہے صورت تیری

(۴۹) جاڑے کی بہار

(نظیر اکبر آبادی)

جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

دن جلدی جلدی چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
پالا بھی برف پگھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
چلّا خم ٹھونک اُچھلتا ہو تب دیکھ بہاری جاڑے کی

دل ٹھوکر مار پچھاڑا ہو اور دل سے ہوتی ہو کُشتی سی
تھر تھر کا زور اکھاڑہ ہو بجتی ہو سب کی بتیسی
ہو شور پھپھو ہو ہو ہو کا اور دھوم ہو سی سی سی کی
کلّے پر کلّہ لگ لگ کر چلتی ہو منہ میں چکی سی
ہر دانت چنے سے دلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہر ایک مکاں میں سردی نے آ باندھ دیا ہو یہ چکر
جو ہر دم کپ کپ ہوتی ہو ہر آن کڑاکڑ اور تھر تھر
بیٹھی ہو سردی رگ رگ میں اور برف پگھلتا ہو پتھر
جھڑ باندھ مہاوٹ پڑتی ہو اور تس پر لہریں لے لے کر
سنّاٹا باؤ کا چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہر چار طرف سے سردی ہو اور صحن کھلا ہو کوٹھے کا

اور تن میں نیمہ شبنم کا ہو جس میں خس کا عطر لگا
چھڑکاؤ ہوا ہو پانی کا اور خوب پلنگ بھی ہو بھیگا
ہاتھوں میں پیالہ شربت کا ہو آگے اک فراش کھڑا
فراش بھی پنکھا جھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

(۵۰) برکھا رُت

(منشی درگا پرشاد گہر لکھنوی)

مبارک! جھومتی برسات آئی
عجب پیاری گھٹا گھنگھور چھائی
برسنے اور گرجنے فوج لے کر
فلک پر بادلوں نے کی چڑھائی
لگی ہونے بکثرت گولہ باری
دنا دن توپ کی آواز آئی
دکھائی برق تاباں نے جو مہتاب
چھٹی خورشید کے منہ سے ہوائی
رہا کچھ دیر شندرستاہ خاور
حرارت آگئی تیزی دکھائی
چڑھا پایا آسماں کو ساں پر جب
تو دیدی اس کو نیلم کی صفائی
مگر اتنی کہاں ہمت کہاں تاب
گھٹا ٹوپ اک دیا لشکر دکھائی
ہوا کوندا تو آنکھیں تلملائیں
کلیجا ہل گیا دہشت سمائی
چھپا سنتے بن پڑا پردے ہی میں منہ
جو دیکھا فوج ہر سو سے گھر آئی

حکومت شاہ گردوں کی گئی چھن — عمل داری ہوئی دم میں پرائی
دھنڈورا پٹ گیا از غرب تا شرق — ہے اب برسات کی فرماں روائی
لٹایا ابرِ رحمت نے خزانہ — مرادِ اہلِ دل دم میں بر آئی
دیئے مخمل چمن کو خلعتِ نو — قبا خوش رنگ پھولوں کی پہنائی
ہوئے شاداب گل بوٹے چمن کے — عجب قدرت نے بخشی خوش نمائی
کھلا گیندا ہزارہ کھل کھلایا — بگل کیلوں نے پھونکا با صفائی
گرہ چوٹی کی سنبل نے جو کھولی — دھڑی ہونٹوں پہ سوسن نے جمائی
گل شبو نے طرفہ گل کھلایا — اِدھر چمپا کلی بھی مسکرائی
کھلے گل چاندنی باغوں میں پھیلی — چھٹی مہتاب کے منہ پر ہوائی
جڑاؤ آرسی سورج مکھی نے — عروس باغ کو دی رونمائی
بنے گل کے کرن پھول اک ادا سے — اِدھر سپر شاخ چھاپ رنگ لائی
بہار آئی کنول نہروں میں پھولے — خودی سے بیخودی بھنوروں پہ چھائی
چلیں ٹھنڈی ہوائیں اس طرح سے — ہوئی غش قدرتی معجز نمائی
ہوئے جب مرغ خوش الحاں نغمہ خواں — صدا دی بانسری کی سی سنائی
پپیہوں نے اِدھر پی پی پکارا — صدا کو کو کی کوئل نے لگائی
اِدھر نقارے پر دی ابر نے چوٹ — اُدھر جھنکار جھینگر نے لگائی
جو پر پھیلا کے بن میں مور ناچے — فلک پر کی شفق نے خوشنمائی

ہوئی خلقِ خدا مسرور ازبس — ہر اک دل پر گھٹا عشرت کی چھائی
گھٹائیں پڑ رہی ہیں چمکا ستارہ — عجب جگنو نے کی جلوہ فزائی
کسانوں نے خوشی سے دھان بوئے — ہری کھیتی ہوئی امید پائی
بہا کھیتوں میں کیا آب از ہر سو — جھڑی جب ابرِ رحمت نے لگائی
ندی تالاب چشمے جھیل دریا — بھرے ایسے ہوئی گھر گھر ترائی
ندی نالوں نے ایسا زور باندھا — ہوئے کافور امراضِ وبائی
انوکھی چھب نرالی دھج بنائی — عجب انداز سے برکھا رت آئی
اُڑی ہر سو بھبیری ساون آیا — ہوا مشرق کی جانب سنسنائی
چھپائی ابر میں تاروں نے آنکھیں — شبِ مہتاب بجلی بن کے آئی
خجل ہے جس کے آگے میناکاری — وہ ہے خوش رنگ دیواروں پہ کائی
حسیں باغوں میں جھولا جھولتے ہیں — ہرا کرتی ہے دل نغمہ سرائی
ہنڈولوں پر ہنڈولے گا رہے ہیں — بتانِ خوب رو با خوش نوائی
لگاتا ہے ملاروں کی کوئی تان
دکھاتا ہے کوئی دستِ حنائی

شاعر کی التجا (۵۱)

ذوقی بی اے (علیگ)

سر جھکائے ہوئے خاموش پجاری کی طرح
تیرے دربار میں آیا ہوں بھکاری کی طرح

روح افسردگیٔ ذوق سے بیحد ہے ملول
خلشِ شوق کے ناپید ہیں اسباب حصول

سازِ دل نغمۂ بیتاب سے یکسر خالی
کشتِ جاں موجۂ شاداب سے یکسر خالی

زندگی خستگیٔ جذبات سے برباد و خراب
بے حسی وہ کہ جوانی بھی مری ننگ شباب

ذہن ناکام و مقید ہے نگاہیں محدود
طائرِ شوق کے پرواز کی راہیں مسدود

روح ٹھٹھری ہوئی بیگانۂ تابش ہے الگ
عقل افسردہ و محروم نوازش ہے الگ

دل سے جولانیٔ ارماں کی حرارت مفقود

کشمکشہائے تمنا کی حرارت مفقود
قلب پر ابرِ کثافت کی گرانباری ہے
سینۂ سرد پہ خاموشیٔ غم طاری ہے

پھونک دے وہ نفسِ گرم مرے سینے میں
بال پڑ جائے مرے قلب کے آئینے میں
فطرتِ عشق کو اسبابِ ضیا باری دے
دل کے سوئے ہوئے جذبات کو بیداری دے
طائرِ روح کو مل جائے وہ پروازِ خیال
لے اُڑے بامِ فلک کو بھی تگ و تازِ خیال
چشمِ پُر شوق کو مخمورِ تماشا کر دے
دل میں وجدان محبت کا اُجالا کر دے
میرے الفاظ میں وہ سوز و اثر پیدا ہو
ہر طرف شعلہ نوائی کا مری چرچا ہو
سارے عالم پہ ہو محویت و وجدان طاری
جھوم جائے مرے اشعار سے دنیا ساری

---

(۵۲) ستارہ

ڈاکٹر سر محمد اقبال

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو
مآلِ حسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو
متاعِ نور کے لٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو
ہے کیا ہراسِ فنا صورتِ شرر تجھ کو
زمیں سے دور دیا آسماں نے گھر تجھ کو
مثالِ ماہ اڑھائی قبائے زر تجھ کو
غضب ہے یہ تری ننھی سی جان ڈرتی ہے
تمام رات تری کانپتے گزرتی ہے
چمکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے
جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل

عدم علام ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

(۵۳) شریف بیبیاں

خواجہ الطاف حسین حالی

اے ماؤ بہنو بیٹیو دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں قوموں کی عزت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں شہروں کی ہو آبادیاں
غمگیں دلوں کی شادیاں دُکھ سکھ میں راحت تم سے ہے
تم ہو تو غربت ہے وطن تم بن ہے ویرانہ چمن
ہو دیس یا پردیس جینے کی حلاوت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں ایماں سلامت تم سے ہے
فطرت تمہاری ہے حیا طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبارت تم سے ہے

مردوں میں ست والے تھے جو ست بیٹھے اپنا کب کا کھو
دنیا میں اے ستونتیو لے دے کے اب ست تم سے ہے
مونس ہو خاوندوں کی تم غمخوار فرزندوں کی تم
تم بن ہے گھر ویران سب گھر بھر میں برکت تم سے ہے
تم آس ہو بیمار کی ڈھارس ہو تم بیکار کی
دولت ہو تم نادار کی عسرت میں عشرت تم سے ہے
آتی ہو اکثر بے طلب دنیا میں جب آتی ہو تم
پر موہنی سے اپنے یہاں گھر بھر پہ چھا جاتی ہو تم

(۵۴) بچہ کی قبر

مرزا محمد ہادی عزیز

بے خبر ماں تجھ کو اس بچہ کی بھی ہے کچھ خبر
گود میں تیرے ہمکتا تھا جو کل تک بار بار
گوری گوری اسکی رنگت اور وہ مکھڑا چاند سا
اور وہ صورت اسکی جس پر رات دن تھی تو نثار
کل بلائیں لیتی تھی تو دیکھ کر انداز خواب

آج کیوں آتا نہیں سونے پہ اسکے تجھکو پیار
اُف وہ وحشتناک جنگل اور اندھیاری وہ رات
آہ وہ معصوم بچہ اور وہ کنج مزار
بے خبر ہے دیکھ ڈر جائے نہ وہ بچہ کہیں
کیا اسے آغوش میں لیتا ہے تیرا ننگ و عار
کیا ہوئی وہ تیری الفت کیا ہوئی وہ مامتا
کیوں نہیں اس کے لئے دل آج تیرا بیقرار
اپنے سینے سے لگا کر تو سلاتی تھی اسے
آج وہ ہے اور ایک کنج لحد تاریک و تار
آج لپٹے ہیں اسی میں چند کپڑے قبر کے
جس گلے میں تو نے پہنائے تھے تعویذوں کے ہار
ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہے اٹا سب خاک میں
ہائے وہ پیکر جو کل تک تھا ترے زیب کنار
جب تری آواز سنتا تھا مچل جاتا تھا وہ
آج وہ ہے اور خموشی چاہے لاکھ اسکو پکار
اک اشارے سے کسی کے ہو گئی ہے آج بند
اس کی وہ آواز جو تھی رد کش صوت ہزار

جس کو پہنایا تھا تو نے جامۂ گل دوز کل
آج اُس کے تن پہ کیڑوں نے کئے نقش و نگار
زندگی میں تو ہر اِک عیب و ہنر پہ تھی نظر
دیکھ لے یہ حال بھی جاکر بچشم اعتبار

(۵۵) سفر آخرت

انیس

کچھ دن بشر اس خانۂ دنیا میں ہے مہماں
دست ملک الموت میں ہے سب کا گریباں
زندوں میں ہیں گر آج تو کل ہوینگے بیجاں
پہلے سے ہے لازم سفر مرگ کا ساماں
اعمال و عقائد میں نہ ہرگز خلل آئے
کیا جانئے کسوقت پیام اجل آئے
بھائی نہ تو کام آئے گا اس وقت نہ فرزند
عرصہ نہیں۔ کھل جائیگا۔ جب آنکھ ہوئی بند
وہ کام کرو جس سے خدا ہوئے رضامند

ہوشیار کہ ہونا ہے تمہیں خاک کا پیوند
پیری کی بھی مدت ہے جوانی کی بھی حد ہے
آرام گہ شاہ گدا کنج لحد ہے
اس زیست پہ پھولو نہ اجل کو بھی کرو یاد
گھر سیکڑوں یاں سیل فنا نے کئے برباد
دنیا میں عمارت نہ بنا کر ہو کوئی شاد
اس قالب خاکی کی عجب سست ہے بنیاد
کل اوج پہ جو لوگ تھے وہ زیر زمیں ہیں
ہے خاک کا ڈھیر اب یہ مکاں ہیں نہ مکیں ہیں
دنیا یہ صدا عبرت و اندیشہ کی جا ہے
یاں کیا مقام آٹھ پہر کوچ لگا ہے
جاتے ہیں چلے مرگ کا دروازہ کھلا ہے
رہجائے نہ کوئی بھی آواز درا ہے
ہے راہ کڑی زاد سفر پاس نہیں ہے
منزل پہ پہونچنے کی ہمیں آس نہیں ہے

(۵۶) اندھی پھول والی کا گیت

سید مہدی حسن۔ احسن

گود میں مالن کے ہیں ٹوٹے ہوئے ڈالی کے پھول
لو خریدارو یہ اندھی بیچنے والی کے پھول
تم ہو جس دنیا کے ساکن نور کی دنیا ہے وہ
عالم ظلمات۔ مجھ مجبور کی دنیا ہے وہ
ہو مبارک تم کو دنیا کے نظارے دیکھنا
دن کو نورِ مہر شب کو چاند تارے دیکھنا
میں وہاں ہوں ہے اندھیرا گھپ جہاں چھایا ہوا
ہے تصور اس سیہ خانہ میں گھبرایا ہوا
تم کو قدرت نے عطا کی قوتِ نظارگی
اور میں محرومِ قدرت۔ بندگی بیچارگی
نظمِ دنیا کا ہے جامِ جم تمہارے واسطے
تم ہو عالم کے لئے عالم تمہارے واسطے
فلسفہ قدرت کا ان پھولوں میں دکھلاتی ہوں میں

ان میں جو جو خوبیاں ہیں تمکو سمجھاتی ہوں میں
طفلِ غنچہ بڑھ کے یہ آزادِ گل بوٹے ہوئے
آ گئے ہیں اپنی ماں کی گود سے چھوٹے ہوئے
وہم ہے نقش و نگارِ گل غلط ہے یہ گماں
عارضِ گل پر ہیں پیاری ماں کے بوسوں کے نشاں
باعثِ عبرت ہے ان کا عالمِ افسردگی
مادرِ گیتی سے چھٹ کر پائی ہے پژمردگی

نازپروردِ چمن ہیں یہ جوانانِ چمن
حسن کی دنیا کے ساکن ہیں یہ یارانِ چمن
کل کے دن تک تھے یہی سب طرہ و دستارِ باغ
ان کی رونق دیکھتی تھی نرگسِ بیمارِ باغ
دستِ گلچیں سے حفاظت ولیں تھے ٹھانے ہوئے
خارِ گلشن ہر طرف تھے برچھیاں تانے ہوئے
جب ہوئے پورے جواں تو ہو گئے عاشق مزاج
اب خود انکو صاحبانِ حسن کی ہے احتیاج
آرزو یہ ہے کسی کی طرۂ دستار ہوں
خواہشیں یہ ہیں حسینوں کے گلے کا ہار ہوں

باوفا خود ہیں اور ہر حالت میں یہ دلسوز ہیں
اور حسینوں کو اتالیق وفا آموز ہیں
ہمدم راحت بھی ہیں اور غمگسار غم بھی ہیں
رونق شادی شریک محفل ماتم بھی ہیں
صرف بزم عیش معشوق ستم ایجاد بھی
اور کبھی زیب مزار عاشق ناشاد بھی
لو خریدار و چلو یہ بے رخی اچھی نہیں
رات بھر کی ہے یہ رونق صبح کو کچھ بھی نہیں
خندہ زن ہیں ایک شب کی زندگانی کے لئے
اپنے گھر لے جاؤ ان کو میہمانی کے لئے

۵۷) غزل خالص اردو

حضرت آرزو لکھنوی

جی رہے ہیں جب تو ہیں مر مر کے ہم
پڑ گئے جھگڑے میں ہامی بھر کے ہم
آن پڑے اک یہ بھی جی کے بھید کی

پوچھنے والے نہیں بچھڑ کے ھم
آنسو، جی میں جھجک ہے کس لئے؟
اب اکیلے ہی ہیں اپنے گھر کے ہم
اُن کے چند راستے پہ جی اُمڈا تو تھا
رہ گئے اک سانس ٹھنڈی بھر کے ہم
بے سہاروں کا سہارا کچھ نہ پوچھ
سوتے ہیں ہاتھ اک سرہانے دھر کے ہم
کھل کے تم کہہ دو تو دکھلا دیں ابھی
اپنے ہاتھ اپنے لہو سے بھر کے ھم
جس کو ہے دیکھے نہیں ہے اب بھی چین
ہائے گھائل ہیں اسی تیور کے ھم
آس میں اس کی نہ اب سکھ ہے نہ دکھ
تکتے تکتے بن گئے پتھر کے ھم
ان کے آگے آرزو یہ بات بھی
کہہ نہیں سکتے ہیں مارے ڈر کے ہم

---

(۵۸) دنیا اور آخرت

سید علی حیدر طبا طبائی

اے ہمسفرانِ دشت غربت ہشیار
جاگو کہ نمایاں ہیں سحر کے آثار
چونکو کہ ضرر ہے سوتے رہنے میں ہزار
اٹھو کہ یہ سیلاب کی ہے راہگذار

سامان کر رکھ یہاں سے چلنے کے لئے
رکھ پاس عصا گر کے سنبھلنے کے لئے
منہ کھولا ہے قبر نے نگلنے کے لئے
اور تاک میں ہر وقت ہے چرخ غدار

رہتے ہیں سدا فکرِ عمل سے غافل
سب آج کی فکروں میں ہیں کل سے غافل
کیونکر نہ رہیں فکر اجل سے غافل

کیا کم ہیں بشر کو زندگی کے آزار

دو دن کی ہے زیست اور دھندے لاکھوں
انساں کا گلا ایک ہے پھندے لاکھوں
خود زیست سے بیزار ہیں بندے لاکھوں
سچ پوچھو تو زندگی ہے خود اک آزار

جینا بھی یہاں کا سخت مرنا بھی ہے سخت
دونوں کا ہے ایک حال تختہ ہو کہ تخت
خالی نہیں غم سے زندگانی یک لخت
جینا ہے کب آسان جو ہے مرنا دشوار

بے سود ہے غیر پر بھروسا کرنا
اپنے ہاتھوں ہوا اپنا جینا مرنا
لازم ہے قدم سنبھل سنبھل کر دھرنا
رہبر ہے یہاں ایک تو رہزن ہیں ہزار

پدمنی (۵۹)

سرور جہاں آبادی

عندلیبوں کو ملی آہ و بکا کی تعلیم
اور پروانوں کو دی سوز وفا کی تعلیم
جب ہر اک چیز کو قدرت نے عطا کی تعلیم
آئی حصے میں ترے ذوق فنا کی تعلیم
نرم نازک تجھے اعضا دیئے جلنے کے لئے
دل دیا آگ کے شعلوں میں پگھلنے کیلئے

رنگ تصویر کے پردے میں جو چمکا تیرا
خود بخود لوٹ گیا جلوہ رعنا تیرا
ڈھال کر کالبد نور میں پتلا تیرا
یہ قدرت نے بنایا جو سراپا تیرا
بھر دیا کوٹ کے سوز غم شوہر دلمیں
رکھدیا چیر کے اک شعلۂ مضطر دلمیں
تو وہ تھی شمع کہ پروانہ بنایا تجھکو

تو وہ لیلےٰ تھی کہ دیوانہ سبنا یا تجھکو
رونق خلوتِ شاہانہ بنا یا تجھکو
نازش ہمت مردانہ بنا یا تجھکو
ناز آیا ترے حصے میں۔ ادا بھی آئی
جاں فروشی بھی۔ محبت بھی وفا بھی آئی
آئی دنیا میں جو تو حسن میں یکتا بنکر
چمن دہر میں پھولی گل رعنا بنکر
رہی ماں باپ کی آنکھوں کا جو تارا بنکر
دل شوہر میں رہی خال سویدا بنکر
حسن خدمت سے شگفتہ دل شوہر رکھا
گہ قدم جادہ طاعت سے نہ باہر رکھا
تیری فطرت میں مروت بھی تھی غمخواری بھی
تیری صورت میں ادا بھی تھی طرحداری بھی
جلوہ حسن میں شامل تھی نکوکاری بھی
درد آیا ترے حصے میں تو خودداری بھی
آگ پر بھی نہ تجھے آہ مچلتے دیکھا
تپش حسن کو پہلو نہ بدلتے دیکھا

تو وہ عصمت کی تھی اک آئینۂ سیما تصویر
حسن سیرت سے تھی تیری مجلّا تصویر
لاکھ تصویروں سے تھی اک تری زیبا تصویر
تجکو قدرت نے بنایا تھا سراپا تصویر
نور ہی نور ترے جلوۂ مستور میں تھا
انجم ناز کا جھرمٹ رخ پُر نور میں تھا
لب میں اعجاز، جبا چشم فسوں ساز میں تھی
کہ قیامت کی ادا تیرے ہر انداز میں تھی
شکل پھرتی جو تری دیدۂ غماز میں تھی
برق بیتاب تری جلوہ گہ ناز میں تھی
یہ وہ بجلی تھی قیامت کی تڑپ تھی جسمیں
شعلۂ نار عقوبت کی تڑپ تھی جس میں
یہ وہ بجلی تھی جو تیغ شرر افشاں ہوکر
کوندا اٹھی قلعۂ چتوڑ میں جولاں ہوکر
یہ وہ بجلی تھی جو سوز غم حرماں ہوکر
خاک سے لوٹ گئی تیری پشیماں ہوکر
یہ وہ بجلی تھی تجھے جس کے اثر نے پھونکا

رفتہ رفتہ تپشِ سوزِ جگر نے پھونکا

آہ او عشوہ و انداز و ادا کی دیوی

آہ او ہند کے ناموس وفا کی دیوی

آہ او پرتوِ انوار صفا کی دیوی

اور نہ یارت کردہ شرم و حیا کی دیوی

تیری تقدیس کا قائل ہے زمانہ ابتک

تیری عفت کا زباں پر ہے فسانہ ابتک

آفریں ہے تری جانبازی و ہمت کے لئے

آفریں ہے تری عفت تری عصمت کیلئے

کیا ستائیگا زمانہ تری شہرت کے لئے

کہ چلی آتی ہے اک خلق زیارت کے لئے

نقش ابتک تری عظمت کا ہے بیٹھا دلمیں

تو وہ دیوی ہے ترا لگتا ہے میلا دل میں

(۶۰) تماشائے عالم

غلام احمد خاں احمدی

مسافر ہے تو اے بازار امکاں کے تماشائی
کہاں تک الجھا نہ خودپسندی اور خودرائی
ذرا چشم بصیرت کھول گر رکھتا ہے بینائی
ترے کس کام آئیں گے خیالاتِ من ومائی
اُڑی خوشبوئے گل ہے رنگ زردئے نسترن پھیکا
بعجلت پھول چننے ہونے کو ہے رنگِ چمن پھیکا
تجھے معلوم ہے کس واسطے تو باغ میں آیا
وہ کیا ۔ سب تماچس کے واسطے سلطان نے بھجوایا
نہ بھولے سے کوئی دم بھی ادھر کچھ دھیان فرمایا
کہ میں ہوں کون جاتا ہوں کدھر کس سمت سے آیا
مرا نخل بقا کب تک چمن میں لہلہائے گا
ہزارِ ہستی موہوم کب تک چہچہائے گا
معین وقت تک تجھ کو ملا ہے سیر کا فرمان

غرض یہ تھی کہ جب ہو جلوہ بخشِ گلشنِ امکاں
ترے آنے سے ہوں سب ہمصفیرانِ چمن شاداں
چلن ہے تو عزیزِ دل ہو ان کا اور سرِ دیرِ جاں
تو ہر اک حال میں ان کا شریک ہمنوائی ہو
دلوں میں ان کے جا ہو تیری سینوں میں سمائی ہو
مصیبت جس کو پیش آئے تو اُس کا آشنا تو ہو
کوئی ماتم زدہ پائے تو اُس کا غم رُبا تو ہو
کوئی ہو راہ گم کردہ تو اُس کا رہنما تو ہو
غرض ہر زخم کا مرہم ہو ہر دُکھ کی دوا تو ہو
جہاں مشکل کی پڑ جائے گرہ ناخن ترا کھولے
تو ہر اک درد میں شامل ہو ہر آدا زمیں لولے
ملا کر آنکھ مجھسے کہہ تو اس میں سے کیا کیا کیا
رکھا کس زخمِ دل پر مرہم امداد کا پھایا
نکالا دشتِ غربت میں کسی کے پاؤں کا کانٹا
کسی آفت زدہ کا بوجھ کم تو نے کیا ہلکا
بچایا ہے کسی گم کردہ رہ کو رہنما ہو کر
کیا ہے پار بیڑا بھی کسی کا ناخدا ہو کر

اگر غفلت سے اب تک کچھ نہیں تو نے کیا غافل
تو اس خواب گراں سے چونک آمندہ نہو کاہل
بڑھے جاتے ہیں ساتھی ہمسفر نزدیک ہے منزل
یہ فرصت بھی غنیمت ہے اگر کرنا ہے کچھ حاصل
اولوالعزمانِ دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر پھاڑتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

(۶۱) گل بکاؤلی کا ضطراب

پنڈت دیاشنکر نسیم لکھنوی

گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا
اور غنچۂ صبح کھلکھلایا
وہ سبزۂ باغ خواب آرام
یعنی وہ بکاؤلی خوش اندام
جاگی مرغ سحر کے غل سے
اٹھی نکہت سی فرش گل سے

منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پُر آب وہ چشم غوص پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل
جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے
اپنوں میں سے پھول لے گیا کون
بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون
شبنم کے سوا چرانے والا
اوپر کا تھا کون آنے والا
جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے
جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے
آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا

پتلی وہی چشم حسن کا تھا
گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا
غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا چنگل
مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او بادِ صبا ہوا نہ بتلا
خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے
گل تو ہی مہک سنگھا کدھر ہے
لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام
تھی سبزہ سی راست مو براندام
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا
جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا
رنگ اسکا غرض لگا بدلنے
گل برگ سے کف لگی وہ ملنے
گل کا سا لہو بھرا گریباں
سبزہ کا سا تار تار داماں

دکھلا کے کہا حسن پری کو
اب چین کہاں بکاؤلی کو
تھی بسکہ غبار سے بھری وہ،
آندھی سی اُٹھی ہوا ہوئی وہ
ہر باغ میں پھولتی پھری وہ،
ہر شاخ میں جھولتی پھری وہ
جس تختہ میں مثلِ باد جاتی
اس رنگ کے گل کی بوند پاتی
بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے
تیا کہیں حکم بن ہلا ہے

(۶۲) صبح کا سماں

میر ببر علی انیس

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور

پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور
وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور
گلشن خجل تھے وادی مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے
ٹھنڈی ہوا وہ سبزہ صحرا کی وہ لپک
شرمائے جس سے اطلس زنگاری فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ چمک
ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے
وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا
دراج و کبک و تیتر و طاؤس کی صدا
وہ جوش گل وہ نالۂ مرغان خوش نوا
سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبد گل فروش تھے
وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار

پھولوں پہ جابجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے زہر گلشن زہر احباب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے
وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم
کوکو کا شور نالہ حق سرہ کی دھوم
سبحان ربنا کی صدا تھی علی العموم
جاری تھے وہ جو اسکی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوک زباں تھی خدا کی مدح

(۵۴) علیگڈھ کالج سے رخصت

مولانا محمد علی جوہر

دم بھر کی جسے فرصت یہ چرخ ستمگر دے
وہ شخص تو البتہ یاں عیش منائے گا

صحبت سے اگر اپنے اوروں کو کریگا خوش
احباب کی صحبت کا کچھ لطف اٹھائے گا
اصرار سے اوروں کے گہہ توڑ کے تقویٰ کو
میخانہ کی صحبت کا اک جام چڑھائے گا
گاہے مئے گلگوں سے دو ایک سبو بھر کر
خود پیر مغاں بنکر اوروں کو پلائے گا
گر پچھلے زمانے کا چھڑ جائے کہیں قصہ
اوروں کی سنیگا کچھ، کچھ اپنی سنائیگا
صحبت میں اگر انکی بھولے گا کچھ اپنے غم
کچھ رنج و محن ان کے بھی دل سے مٹائیگا
لیکن جسے طے کرنا ہو صبح کی اک منزل
اس شخص کا محفل میں کیوں دل نہ بھر آئیگا
کس طرح سے صحبت سے محظوظ ہو اسکا دل
احباب سے کل جس کو یہ چرخ چھڑائیگا
ہو گونجتی کانوں میں آوازہ جرس جس کے
وہ اپنی کہتا اوروں کو خاک سنائے گا
ساقی کی ظرافت سے مسرور ہو وہ کیونکر

پو پھٹتے ہی جس بیکس کا قافلہ جائے گا
مے ہوئے کہ نغمہ ہو فرصت میں ہیں سب اچھے
دم بھر کا جو مہماں ہے کیا لطف اُٹھائے گا
ہم جاتے ہیں اے کالج پر یاد رہے اتنا
یاد آئے گی جب تیری تو خون رلائیگا
اس بلبل بیکس کو جو قید قفس میں ہو
کیا اسکو گل و گلشن بھی یاد نہ آئیگا
دل رکھتے ہو اسے یار و تو کہد و خدا لگتی
کیا تم سے الگ رہنا کچھ دل نہ دکھائیگا
سیکھی تھی محبت جو یاں آٹھ برس رہ کر
جو تیرا اسے کسطرح پھر دل سے بھلائیگا
جس حال میں ہم ہونگے اک حشر بپا ہوگا
ایام گذشتہ کا کچھ دھیان جب آئیگا
کالج کے لئے لیکن نکلے گی دعا دل سے
ہر بار زباں پر یہ مطلع مگر آئے گا
کیا بادۂ گلگوں سے مسرور کیا دلکو
داتا رکھے آباد اں ساقی تری محفل کو

تمام شد